شاہ عبداللطیف بھٹائی
شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات سندھ

فہرس

مقالے

نظمیں

کہانیاں

عرضِ حال

سیّد عارف شاہ گیلانی

میری ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ سندھ اور اس کے ادب و ثقافت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ کتابیں شائع ہوں- تاکہ ولیوں- صوفیوں- شاعروں اور دوسرے فنکاروں کی اس محبوب سر زمین کے بارے میں اب تک جو لاعلمی رہی ہے- اسے دور کیا جاسکے اور لوگوں پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوسکے کہ یہ "خطہ پاک" آج سے نہیں بلکہ صدیوں سے تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے اور یہاں ایسی ایسی اولوالعزم ہستیاں پیدا ہوئی ہیں جن پر سندہی کو نہیں بلکہ عالم انسانیت کو ناز ہے-

اگرچہ میری یہ خواہش عملی طور پر پوری نہ ہوسکی تاہم یہ ضرور ہوا کہ زمانہ طالب علمی سے لے کر اب تک مجھے جب کبھی بھی موقعہ ملا- میں نے اس سے برابر فائدہ اٹھایا- سندہ مدرسہ کراچی- الفنسٹن کالج بمبئی اور گورنمنٹ کالج شکار پور کی ادبی اور علمی سرگرمیاں اس کی شاہد ہیں- لیکن جب محکمہ اطلاعات سندہ کے ڈائرکٹر کا اہم عہدہ میرے سپرد کیا گیا تو میں نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ مدتوں کی اس خواہش کی تکمیل کا موقعہ مل رہا ہے- اس عظیم ذمہ داری کو قبول کرنے میں پس و پیش نہیں کیا-

میں یہ تو نہیں کہتا کہ مجھے اپنے مقصد میں کما حقہ کامیابی ہوئی ہے- تاہم محکمہ کی جانب سے انگریزی اور سندہی دونوں زبانوں میں جو رسالہ "سندہ شاہراہ ترقی پر" کے نام سے شائع ہوا ہے وہ اس دیرینہ خواہش کا نتیجہ ہے اور خدا کا شکر ہے کہ ارباب علم و فہم نے میری اس ناچیز کوشش کو جس داد و تحسین کا مستحق قرار دیا ہے وہ میرے لئے بڑی حوصلہ افزا ہے-

سندھ کے سب سے بڑے شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری اور ان کی زندگی سے متعلق جو کتاب آپ کے پیش نظر ہے وہ اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے اور اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اردو دان طبقہ کو جو اب تک صحیح طور پر شاہ رحہ کی عظمت سے اچھی طرح متعارف نہیں ہوا ہے۔ شاہ رحہ کے بارے میں اپنی معلومات میں قابل قدر اضافہ کا موقعہ ملیگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب شاہ رحہ جیسے عظیم صوفی شاعر اور انسان کی گوناگوں خصوصیات کو دیکھتے ہوئے مکمل نہیں۔ تاہم ان کے بارے میں پاکستان کے شعراء اور ادیبوں نے جن زریں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ سب اس کتاب میں موجود ہیں اور اس کے مطالعہ سے لوگوں کو شاہ رحہ کی عظیم شخصیت کے بارے میں بہت کچھ معلومات حاصل ہوسکتی ہیں۔

جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں۔ سندھ کو دنیا کی نظروں میں اچھی طرح روشناس کرانے کے سلسلہ میں محکمہ اطلاعات نے جو مفصل پروگرام تیار کیا ہے۔ یہ کتاب اس کی دوسری کڑی ہے۔ سندھ کے ادب۔ ثقافت۔ تاریخ اور تہذیب و تمدن کے بارے میں ابھی بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ اگر ارباب علم و فہم نے ہماری حوصلہ افزائی کی اور ہمارے محبوب وزیر اعلیٰ پیرزادہ عبدالستار کی توجہ شامل حال رہی تو ہم انشاءاللہ اس سلسلہ میں بہت جلد متعدد اچھی کتابیں اور رسائل آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرینگے۔

سندھ کا ماضی شاندار ہے اور حالات جس تیزی سے روبہ اصلاح ہیں۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس سر زمین کا مستقبل ماضی سے بھی زیادہ شاندار ہوگا۔ جہالت کی تاریکی کائی کی طرح پھٹ رہی ہے اور علم کا آفتاب افق سے طلوع ہوچکا ہے۔

ہمارا محکمہ ان حالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے میں منہمک ہے اور مجھے توقع ہے کہ مستقبل کا مورخ اس سلسلہ میں ہماری کوششوں کو نظر انداز نہیں کریگا۔

حاصل عمر نثار رہ یاری کردم
شادام از زندگی خویش کہ کاری کردم
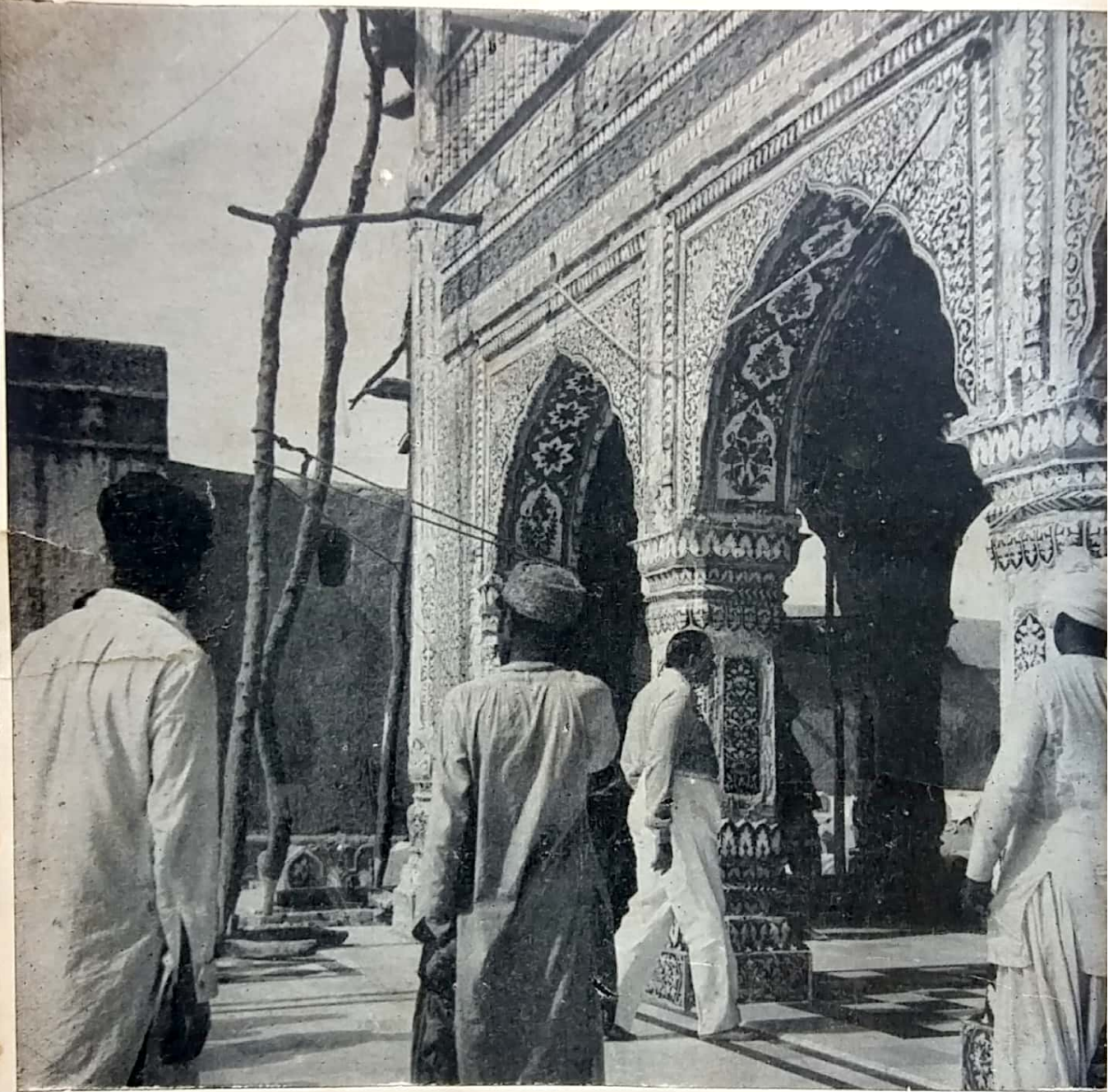
سندھ کے وزیر اعلیٰ عزت مآب پیر زادہ عبدالستار روضہ میں داخل ہو رہے ہیں

گلہائے عقیدت

نغمہ از پردہ ساز ازل
جلوہ از خلوت راز ازل
صوفی از صافیان پاک دل
قلب او از سوز یزداں مشتعل
روح او از نور مطلق مستنیز
باوجود پاک پاکیزہ ضمیر

نغمہ کو عقدہ دلہا کشود
شاہ ما۔ عبداللطیف ما سرود
در حریم شوق و در بزم صفا
بود با جامی و رومی ہمنوا
باطن عطار رنگ ظاہرش
غالب و اقبال و بیدل آخرش

رئیس امروہوی

اعتراف و تشکر

L (12) 643—B

مجھے جس وقت ڈاکٹر سید عارف شاہ گیلانی نے شاہ عبداللطیف بھٹائی کی زندگی اور شاعری سے متعلق محکمہ کی تجویز سے مطلع کیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے اس کتاب کی ترتیب و اشاعت کی ذمہ داری سپرد فرمائی تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

شاہ رحہ جیسی عظیم شخصیت کے بارے میں اس قلیل مدت کے اندر کسی کتاب کی ترتیب یقیناً باعث حیرت تھی لیکن گیلانی صاحب کے مفید مشورے اور احباب کے تعاون سے یہ کتاب آپ کے سامنے ہے۔

اسباب خواہ کچھ بھی ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اردو میں شاہ رحہ کی شخصیت کے بارے میں جو کچھ بھی شائع ہوا ہے وہ سندھ کے اس عظیم شاعر۔ مفکر اور صوفی کے بارے میں اردو داں طبقہ کی لاعلمی دور کرنے کیلئے کافی نہیں۔ اور یہ کتاب اس طبقہ کی معلومات میں اضافہ کیلئے غالباً پہلی کوشش ہے۔

ڈاکٹر گیلانی کے علاوہ جنھوں نے اس سلسلہ میں میری قدم قدم پر رہنمائی کی۔ ریڈیو پاکستان کراچی کے مسٹر خلیق۔ حکومت پاکستان کی وزارت اطلاعات و نشریات کا شعبہ ایڈورٹائزنگ۔ فلمس اینڈ پبلیکیشنز کے مسٹر مفتی اور سندھ گورنمنٹ پریس کے مسٹر صدیقی اور مسٹر روف کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ جن کی مخلصانہ امداد کے بغیر یہ کتاب وقت معینہ پر شائع نہیں ہوسکتی تھی۔ ان حضرات کے علاوہ میں ان تمام شعرا اور ادیبوں کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جن کے مقالات۔ نظمیں اور تراجم اس مجموعہ کی زینت ہیں۔

اشتیاق حسین اظہر

مقالے

عبدالستار پیرزادہ

ڈاکٹر داود پوتا

وقار عظیم

رشید اختر ندوی

رفیق خاور

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ

اللہ بخش عقیلی

عبدالواحد سندھی

آشکار حسین خواجہ

آصف انور جیلانی

نصراللہ خان

احمد بشیر

علی مظہر رضوی

غلام مصطفیٰ قاسمی

عزت مآب پیر زادہ عبدالستار وزیر اعلیٰ سندھ بھٹ شاہ میں منعقدہ
سندھ ادبی کانفرنس میں افتتاحی تقریر فرما رہے ہیں

خراجِ عقیدت

عبدالستار پیرزادہ
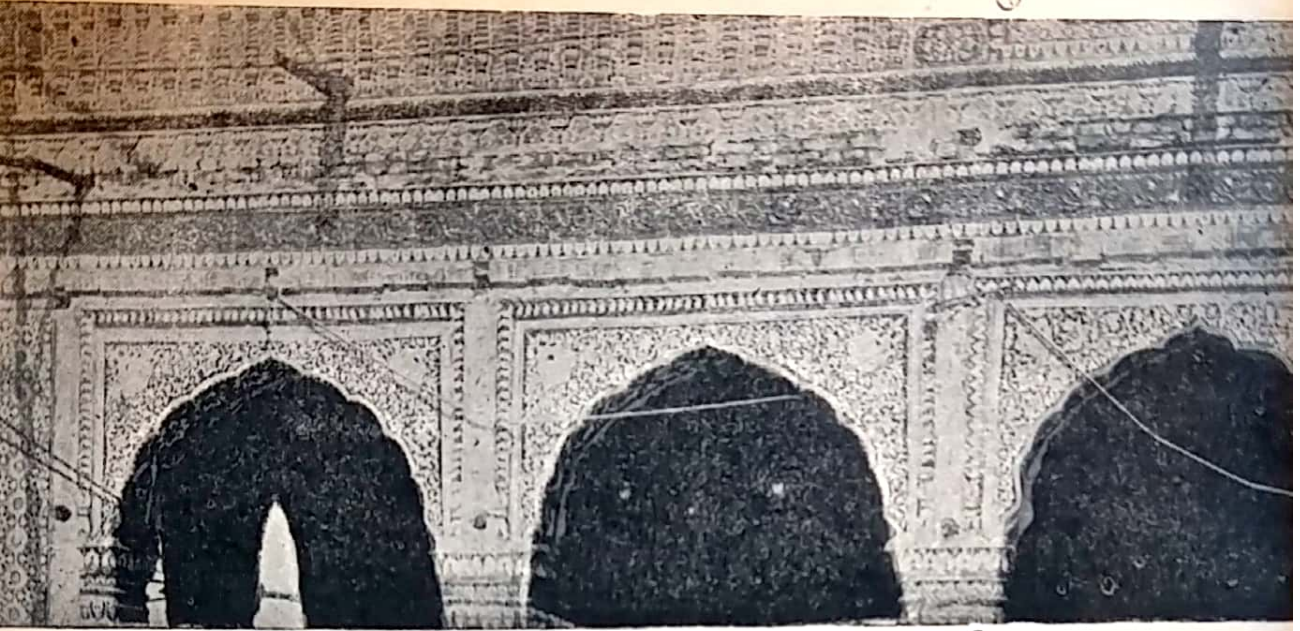
"سندھ کے وزیر اعلیٰ عزت مآب پیرزادہ عبدالستار نے گزشتہ سال شاہ عبداللطیف بھٹائی کے سالانہ عرس کے موقعہ پر منعقدہ سندھ ادبی کانفرنس کا افتتاح فرمایا تھا۔ اس موقعہ پر انہوں نے جو تقریر ارشاد فرمائی تھی اسے ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

——:O:——

محترم صدر و کارکنان لطیف یادگار کمیٹی و دیگر حضرات۔

السلام علیکم! میں آپکا نہایت ہی شکر گزار ہوں کہ آپنے مجھے شاہ بھٹائی کی سالگرہ کے افتتاح کی دعوت دیکر علم دوست حضرات اعلیٰ ادبا اور ماہرین موسیقی کے مجمع سے بیک وقت نہ صرف ملاقات کا موقعہ دیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ سندھ کے عظیم الشان شاعر اور مشرق کے مایہ ناز مفکر شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کمالات اور فضائل پر مقالے اور تقاریر سننے کا موقعہ بھی بہم پہونچایا۔ فی الحقیقت اس سیاسی زندگی میں ہمیں اس قسم کے ادبی جلسوں میں شرکت کے بہت کم مواقع نصیب ہوتے ہیں۔ اس لئے میں آپ جملہ حضرات کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

شروع میں اس ادبی تحریک کے مجوز اور موید شخصیتوں کو میں مستحق مبارکباد سمجھتا ہوں جنہوں نے بھٹ دھنی کے سالانہ عرس کو اس قسم کا ادبی رنگ روپ دیکر عرس پر آنے والے ہزارہا مریدوں اور معتقدوں کو ان کے مرشد کی معرفت حاصل کرنے اور ان کے حال اور قال سے مطلع ہونے کا بہترین موقعہ دیا ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ بھٹائی صاحب کے ہزار ہا مریدین و معتقدین جو دور دراز علاقوں سے سالانہ عرس کے موقعہ پر سال بہ سال یہاں آتے ہیں۔ وہ اگرچہ نہایت خوشی اور اعتقاد سے اپنے مرشد کے مزار کی زیارت کا شرف حاصل کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے اعتقاد میں

اضافہ اس وقت ہوسکیگا جب وہ اس قسم کے ادبی جلسوں میں شریک ہونے والے علماء اور ادباء سے یہ سنیں گے کہ ان کے مرشد جسکو وہ "لال لطیف" کے پیارے نام سے یاد کرتے رہتے ہیں۔ شریعت یا طریقت حقیقت یا معرفت کی کس منزل اور مقام کے مالک تھے اور اس بزرگ کے سندھ اور سندھیوں پر اور کتنے احسانات ہیں۔ وہ فقط شاعر نہیں تھے بلکہ مفکر اور مصور بھی تھے اور ان کی منزل کیا تھی جب وہ اپنے مرشد کا عاشقانہ کلام سنینگے:۔

جي تون بيت ڀانئين سي آيتون آھين ،
نيو من لائين، پريان سندي پار ڏي .

(ترجمہ) جنکو (بظاہر) تم ابیات تصور کرتے ہو وہ (فی الحقیقت قرآنی) آیات ہیں (سوچ سمجھ کے ساتھ پڑھنے والے کو) واصل باللہ بنادیتی ہیں۔

تو ان کے ایمان اور اعتقاد میں مضبوطی پیدا ہوگی۔ دنیا کی تمام قومیں اپنے اپنے ملکوں کے ایسے یگانہ ماہروں۔ مدبروں اور مفکروں کی یاد تازہ کرنے کیلئے اور آنے والی نسلوں میں ان کے قول اور فعل۔ نصیحت اور ہدایت کی پیروی کیلئے امنگیں اور حوصلے پیدا کرنے کیلئے ان کی برسیاں شاندار طریقے سے مناتی ہیں۔ اسلئے یہ تجویز کہ سندھ میں سندھی اور سندھیت کے بہترین علم بردار کی سالگرہ اسطرح منائی جائے۔ نہایت ہی مستحسن اور مناسب ہے۔

میں آپ جیسے اعلیٰ ادباء کی موجودگی میں اپنے آپکو ادیب کہلانے کی جرات تو نہیں کرسکتا مگر جو کچھ میں نے ان ادیبوں سے سنا ہے وہ آپکی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ ایک مشہور سندھی ادیب سے یہ سنکر میری حیرت کی حد نہ رہی کہ سندھ کے ادباء میں سے یا تو ایسے افراد قطعاً نہیں ملینگے یا ملینگے تو بہت ہی کم جو صحیح طور پر یہ دعویٰ کرسکیں کہ شاہ صاحب کے رسالہ میں جو سندھی اور دوسری زبانوں کے الفاظ یا مصطلحات لائے گئے ہیں۔ ان سب کے معانی اور مطالب سے وہ کماحقہ واقف ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاہ صاحب ایک بہترین زبان دان تھے۔ ایک طرف یہ دعویٰ اور دوسری طرف یہ حکایت کہ شاہ صاحب نے کوئی تعلیم حاصل نہ کی تھی۔ یہ دونوں باتیں ایسی ہیں کہ انکی تحقیقات نہایت ضروری ہے۔ اس سے کم از کم یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ شاہ صاحب نے رسمی طور پر کس مکتب میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کی ہو لیکن انکا سینہ معرفت الٰہی سے اتنا معمور تھا کہ وجدانی طور پر انہوں نے یہ اعلان کیا کہ:۔

ملان مار م مون سبق پڑھان یا مچڻ ڏسان .

(ترجمہ) یعنی اے ملا! مجھے مت پیٹئے۔ کیا میں سبق پڑھوں یا محبوب کو دیکھوں؟

یہ جملے معرفت سے اس درجہ معمور ہیں کہ ملا کو لاجواب کرتے ہیں۔ شاہ صاحب یہ فیصلہ ملا پر چھوڑتے ہیں کہ سبق پڑھوں یا محبوب کو دیکھوں۔ دونوں میں سے کونسی بات میں مصروف رہوں۔

- سبحان اللہ۔

یہ حکایت ایک اور معرفت خیز واقعہ یاد دلاتی ہے۔ ایک دن جب مولانائے رومی بر سر منبر وعظ فرما رہے تھے تو حضرت شمس تبریز علیہ‌الرحمتہ کا وہاں سے گذر ہوا اور یہ منظر دیکھکر اور وعظ سنکر کہنے لگے ۰۔

"قال رابگذار مرد حال شو"

جسکا مطلب بھی شاہ کے مذکور سوال اور فصیح و بلیغ عبارت میں سمایا ہوا ہے۔

''سبق پڑھاں یا سھڑ ڈساں''

معلوم ہوتا ہے کہ معرفت الٰہی کے اس ماہر نے اپنے روحانی رہبر سے جو اسباق سیکھے ان کی بنا پر آپکی زبان میں وہ اصلیت وسعت اور جرت پیدا ہوئی جسکی یادگار یقیناً اس وقت تک قائم رہیگی جب تک سندہی زبان زندہ ہے اور مجھے اطمینان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور بزرگوں کی دعا سے سندہ اور اسکی زبان تا ابد زندہ و پائیندہ رہینگے۔

میں کہہ نہیں سکتا کہ شاہ صاحب کے رسالہ میں استعمال کئے ہوئے سندہی الفاظ اور اصطلاحات میں شاہ صاحب کی وفات سے لیکر اسوقت تک کتنا اضافہ ہوا ہے۔ مگر گمان ہے کہ شاید کوئی قابل قدر اضافہ نہیں ہوا ہے۔

مجھے شاہ صاحب کے عقیدتمند سندہی احباب معاف فرمائیں اگر میں صاف طور پر یہ کہوں کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی جیسے غیر معمولی شاعر تخلیقی قوت رکھنے والے مفکر اور محقق سندہ میں پیدا ہونے کی بجائے اگر کسی دوسرے مہذب ملک میں پیدا ہوتے تو وہاں کے لوگ آپکے اقوال اور کلام کو ایسے بام عروج پر پہونچاتے کہ دوسرے ممالک اس پر رشک کرتے۔ مجھے افسوس ہے اور اس بات سے قلب کو کوفت ہوتی ہے کہ ہمارے اپنے صوبہ کی حکومت نے سالہا سال گذرنے کے باوجود اس معاملہ میں کوئی موثر قدم نہیں اٹھایا۔ میرا اور میری حکومت کا یہ پختہ ارادہ ہے کہ جس طرح انگلستان میں شیکسپیئر کا شہر "اسٹرائفرڈ آن ایون" یا ٹیگور کا ثقافتی مرکز "شانتی نکیتن" بنائے گئے اسی طرح ہم بھٹائی صاحب کے چھوٹے ریت کے تودے پر قائم شدہ گوٹھہ کو مذکورہ شہروں کی طرح اوج پر پہونچائیں۔ میرا پختہ ارادہ ہے کہ لطیف یادگار کمیٹی کو از سرنو منظم کرکے ایک مستقل کمیٹی بنائی جائے۔ جسکو حکومت کی طرف سے سالانہ گرانٹ دی جائے اور اس کمیٹی کو سندہ اور سندہی کے پروانے اور صاحب ثروت ہر ممکن امداد بہم پہونچائیں اور شہر کو ایسے عمدہ طریقہ پر بنایا اور سجایا جائے جو ہمارے پیارے لطیف کے شایان شان ہو اور جسکو دنیا بھر کے سیاح دیکھنے آئیں۔ میرا یہ بھی ارادہ ہے کہ ٹیگور کے "شانتی نکیتن" کے طریقہ پر یہاں ایک ثقافتی مرکز بھی کھولا جائے جو ہمارے ادب اور ثقافت کو زندہ کرکے اس کو عروج پر پہونچائے۔ میری حکومت نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ بھٹ کے سالانہ میلہ کو قومی حیثیت دی جائے اور اسکو بلند اور ادبی نمونہ پر چلانے کیلئے وقتاً فوقتاً حکومت سندہ مدد دیتی رہے۔ اس سال سندہ گورنمنٹ

نے لطیف یادگار کمیٹی کو سالانہ میلہ کے انعقاد کیلئے دس ہزار روپیے بطور گرانٹ دئے ہیں۔ بجلی کا سارا انتظام بھی گورنمنٹ کے ذمہ ہے اور ۲۴ اکتوبر کو عام تعطیل کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ مجھے بھروسہ ہے کہ یہ جملہ اقدام اور تجاویز سندھیوں کو عموماً اور آپ جیسے علماء اور ادباء کو خصوصاً پسند آئینگی۔

حضرات! بھٹائی بزرگ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ سندھ اور سندھی زبان کی اس بزرگ خلوت نشین نے جو اعلیٰ خدمت کی ہے اسکی بنا پر یہ لازمی ہے کہ ہر سندھی انہیں خراج عقیدت پیش کرے۔ اگر سندھ کے باشندے شاہ صاحب کی بتائی ہوئی باتوں اور نصائح پر عمل کریں تو دین و دنیا دونوں میں ایک اعلیٰ منزل پر پہونچ سکتے ہیں۔ فی الحقیقت شاہ صاحب ہر طبقہ کے انسانوں کیلئے مشعل ہدایت ہیں۔ اگر صوفیائے کرام ان کو اپنا سرتاج مانتے ہیں تو مصلحین عظام ان کو مالک معراج ہدایت تسلیم کرتے ہیں۔ ایک طرف اگر وہ یگانہ شاعر ہیں تو دوسری طرف بے مثال محقق۔ دیکھا جائے تو وہ کوتاہ نظر انسان کو زمانہ کی بے ثباتی سے باخبر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

”جر ڦوڻو جئين لهرين لڳي اڏ ٿئي،
تون پاڻ آهين تئين دنيا ۾ ڪو ڏينهڙو“

(ترجمہ) اے انسان تم پانی پر بنے ہوئے بلبلے کی طرح ہو جسے پانی کی ایک لہر فنا کردیتی ہے۔ تم بھی دنیا میں ایسے ہی تھوڑا وقت بسر کروگے (سو دنیا کی بے ثباتی پر مغرور مت ہو)۔

اسی خیال کو اور واضح کرتے ہوئے دوسری جگہ ایک لاثانی لہجہ میں فرماتے ہیں:۔

”ڪڏهن ڳاڙهو گهوٽ ڪڏهن مڙه مقام ۾،
واريءَ سندو ڪوٽ اڏي اڏيندين ڪيترو“

جو آج دولہا بنتا ہے وہ کل قبرستان میں دفن ہوگا۔ یہ جو تم (تخیلات کی طویل عمارتیں اور قلعے) بنا رہے ہو وہ ریت کے تودونکی طرح ہیں۔ کب تک ان کو بناتے رہوگے۔

طالب اور مطلوب کو صحیح سبق دیتے ہوئے دیکھئے کہ کس طرح سمجھا رہے ہیں۔ راہ ربانی میں آنے والے مصائب کو مردانہ وار صبر اور خوشی سے برداشت کرنے کا درس دیتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

”لهائين ڪان ليهن سڪ منهنجا سپرين،
سڙي سارو ڏينهن ٻاهر ٻاڦ نه نڪري“

(ترجمہ) اے پیارے تجھکو عشق و محبت میں آلام و مصائب کے جھیلنے کا سبق اور درس کمہار کے آوہ سے لینا چاہئے کہ وہ سارا دن اندر سے جلتا رہتا ہے لیکن منھ سے اف تک نہیں کرتا۔ کبھی دیکھئے کہ سوہنی کی مثال دیتے ہیں کہ وہ

بے خوف و خطر موجوں کی پرواہ کئے بغیر دریا میں داخل ہوجاتی ہے اور پھر کمزوروں کو ہمت کا سبق دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

" گهڙيا سي چڙهيا ، اڱين اڻيئي ،
مٽي متي مهراڻ ۾ پؤ ٻپو ڏيئي
تہ ساهڙ مليئي، سنيوڙو سيڻاه سين "

یعنی جو لوگ غوطہ لگاکر دریا میں داخل ہوگئے وہ اپنے مطلب کو جاکر پہونچے (اسلئے) تم بھی موجوں سے لڑتے ہوئے اپنے محبوب تک جا پہونچو اور کبھی سسی کی مثال پیش کرتے ہیں جو سر کے تصور میں جان ہتھیلی پر رکھکر گھر سے نکل پڑتی ہے۔

ڏاگهن ، ڏيرن ، ڏونگرن ، ٿنهي ڏنم ڏکڙ ،
سي سڀ پانيم سکڙ ، هيڪاند ڪارڻ هوت جي.

(ترجمہ) اونٹوں ڈیوروں (پنوں کے بھائیوں) اور پہاڑوں نے مجھے رنج اور دکھ پہونچایا ہے لیکن میں اپنے پنوں کی وجہ سے ان سب آلام و مصائب کو اپنے لئے سکھ اور سرور محسوس کرتی ہوں۔

کبھی دیکھئے تو شاہ دار کو پھولوں کی سیج جان کر اپنے محبوب سے وصل کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہ منطق سمجھنا بظاہر محال معلوم ہوتا ہے۔ سوہنی کے واقعہ میں گھڑے کا ٹوٹنا عورت (سوہنی) کا مرنا اور اس کے بعد بھی مطلوب (مہینوال) کی آواز کو سننا عوام کی نظروں میں ناممکن ہے۔ مگر یہ وہ حالات ہیں جو موت کو وصل ثابت کرتے ہیں۔

میرے خیال میں اس بات کیلئے دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ حب الوطنی کے حلقہ میں شاہ صاحب اپنی نظیر آپ تھے۔ سندہ کے تھر اور برجنگل اور جھرباڑے اور تھان ڈتھہ اور ڈونرے (گھاس کے قسم) لوئیاں اور ٹوکرے اور ان کے ساتھ سندھیوں کی سادہ مگر عمدہ زندگی جس پسندیدہ پیرایہ سے بھٹائی بزرگ نے پیش کی ہے اسکا احساس فقط وہ لوگ کرسکتے ہیں جنہوں نے ایسی زندگی بسر کی ہوگی۔ حب الوطنی اور وطن پرستی کے جذبات کا اظہار شاہ صاحب نے وطن سے دور بچھڑی ہوئی "مارئی" کی زبان سے جس کے جسم پر جابجا زخم کے نشانات تھے۔ ایسے انداز میں پیش کیا ہے کہ وطن پرستی اور عصمت کی ایک غیر فانی مثال قائم ہوجاتی ہے۔ عمر (بادشاہ) کی دولت اور سلطنت حکومت اور حشمت۔ محلات۔ ریشم اور زربفت۔ چھپر کھٹ اور جھولے مارئی کے قلب سے ڈوندرونکی ڈوئی اور لاکھہ بھری لحاف اور لوئی بھلا نہیں سکتیں۔ دنیا کی جملہ لالچیں

سندھ کی ایک جھونپڑے میں رہنے والی عورت کے اپنے وطن اور عصمت کے مقبلہ میں ہیچ ہیں۔ یہ ہے ایک سندھی عورت کی وطن پرستی اور عصمت کی مثال جو سندھ ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر ایک ملک کی خواتین کیلئے قابل تقلید ہے۔

ماروی کہتی ہے!

'' سکر پانیان سومرا، کتیون کان کنھنبن ''

(ترجمہ) اے قوم کے سردار! (میں زیب و زینت اور آرائش کی طالب نہیں ہوں) میں اپنے گودڑیوں کو کھنبوں (شادی کا مخصوص دوپٹہ) سے بہتر سمجھتی ہوں۔

پھر کہتی ہے!

'' که سي طعام عمر جا، ور سا ڏورن جي ڏوئي ''

یعنی عمر (حاکم) کے اچھے اچھے کھانیں اور طعام گڑھے میں جا پڑیں۔ میرے لئے تو ڈونروں کی ڈوئی ان سے بہتر ہے۔

عصمت کے ساتھ وطن پرستی تو دیکھئے ماروی کی زبان سے شاہ صاحب فرماتے ہیں:-

واجھائي وطن کي، آۓ جي هت مياس،
گور منھنجي سومرا، کج پنھوارن پاس،
ڏج ڏاڏاڻي ڏيه جي، منجھان واڙن واس،
ميائي جياس، جي وڃي مڙه ملير ڏي.

یہ کمال وطن پرستی ہے کہ مذکورہ ابیات میں ماروی وصیت کرتی ہے کہ اگر میں پردیس میں مرجاوں تو میری مٹی ماروں اور بیابانوں میں بستے ہوئے غریب رشتہ داروں کے ساتھ ملانا اور میری میت کو آبائی وطن کے باڑونسے دھواں دینا۔ کاش سندھ کے ہر ایک مرد اور عورت میں ایسی حب الوطنی اور وطن پرستی ہو۔ مجھے نہایت دکھ ہوتا ہے۔ میرے جذبات کو سخت صدمہ پہونچتا ہے۔ میرے دل کو شدید رنج ہوتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ ہمارا سندھ۔ وہ ہمارا پیارا وطن جس کو بھٹائی جیسے عارف باللہ کی دعا نے اوج پر پہونچایا۔ وہ ہمارے اپنے سندھیوں کی نااتفاقی کی وجہ سے ایسی بے کسی کی حالت کو پہنچا ہے کہ ہماری حکومت خود ہمارے اپنے کرتوتوں سے ختم ہوئی اور اس کی جگہ گورنری راج قائم ہوا۔ جس سے ہمارا یہ نقصان ہوا کہ ہمارا تمدن۔ ہماری عزت۔ ہماری آسودگی خوشحالی بلکہ ہمارا وجود شدید خطرہ میں پڑ گیا۔ یہ خدا پاک کی مہربانی ہوئی کہ عین موقعہ پر سندھ میں انتخابات ہوئے اور ہماری اپنی عوامی حکومت وجود میں آئی۔ ورنہ آپ اندازہ لگائیں کہ اگر آج دفعہ ۹۲ الف کے تحت گورنر ہمارا نمائندہ ہوکر سندھ کے حقوق کی حفاظت کیلئے دستور سازی کے اجتماعات میں شامل ہوتا تو ہمارا کیا حشر ہوتا۔ میرے خیال میں یہ ہمارے بزرگوں کی دعا تھی جس نے ہم کو اس بحران سے نکالکر سلامتی کے ساحل تک پہونچایا۔ میں تمام سندھی لیڈروں کا خواہ وہ میرے مسلم لیگی رفقاء ہوں یا

دوسری سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھتے ہوں- نہایت شکر گذار ہوں کہ انہوں نے میری اپیل پر لبیک کہکر اپنے جملہ اختلافات بالائے طاق رکھدئیے اور ایک ہوگئے- میری گذارش اور عریضہ کو مان لیا اور میری طاقت اور ہمت کو اس درجہ بڑھایا جس سے بے خوف ہوکر میں جائز طور پر سندھ کے حقوق کی اچھی طرح حفاظت کرسکا یہ چیز یقیناً قابل فخر ہے- میں یہاں اتفاق اور اتحاد کے علمبردار کے گاوں سے- بھٹائی گھوٹ کے اس پلیٹ فارم سے اور انکی دعا سے سندھ کے ان تمام لیڈروں سے جو اب تک الگ ہیں- اپیل کرتا ہوں کہ ماضی کے اختلافات بھول کر ہمارے اتحاد میں شامل ہوجائیں- اس طرح ہم سب ملکر سندھ کو اس بام عروج و ترقی پر پہونچائیں جسکا وہ مستحق ہے-

میں آخر میں جملہ سندھیوں سے خواہ جوان ہوں یا بوڑھے- چھوٹے ہوں یا بڑے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان کوتاہیوں کی وجہ سے جنکا میں نے ابھی ذکر کیا ہے- ہم قعر مزلت میں جا پڑے ہیں- اس لئے میری پر زور استدعا ہے کہ اٹھو! جاگو! رات دن کام کرو! اور بھٹائی گھوٹ کے ان اقوال پر نظر رکھو-

'' تتيءَ ٿڌيءَ ڪاهه، ڪانهي ويل وهڻ جي،
متان ٿئي اونداهه، پير نہ پسين پرينءَ جو "

(یعنی گرمی سردی میں چلتے رہو- بیٹھنے کا وقت نہیں ہے- کہیں ایسا نہ ہو کہ اندھیرا ہوجائے اور محبوب کے قدموں کا شرف حاصل نہ ہوسکے)

تاکہ ہم ان پر عمل کرکے سندھ کو ایک بہشت بنا سکیں اور ہم پر یہ عتاب نہ ہو-

'' ڪتڻ جي ڪا نہ ڪرين، ستي ساهين هڻ،
صبح ايندوُ اوچتي، عيد اگهاڙن گڏ،
جت سرتيون ڪندءِ سڏ، ات سڪندينءَ سينگار کي ''

یعنی سوت کاتنے کا کوئی خیال نہیں کرتی- سوئی ہوئی کروٹیں بدل رہی ہیں اچانک تمھاری عید عریاں لوگوں میں ہوگی- جہاں تم کو سہیلیاں بلائینگی- وہاں ہار سنگار کیلئے ترستی رہوگی-

آخر میں- میں اپنی تقریر پیارے "لال لطیف" کی اس دعا پر ختم کرتا ہوں اور آپ لوگوں سے عرض کرتا ہوں کہ آپ بھی میرے ساتھ اس دعا میں شامل ہوجائیں-

'' سائينم سدائين ڪرين مٿي سنڌ سڪار،
دوست! تون دلدار، عالم سڀ آباد ڪرين. "

شاہ عبداللطیفؒ

ڈاکٹر داؤد پوتا
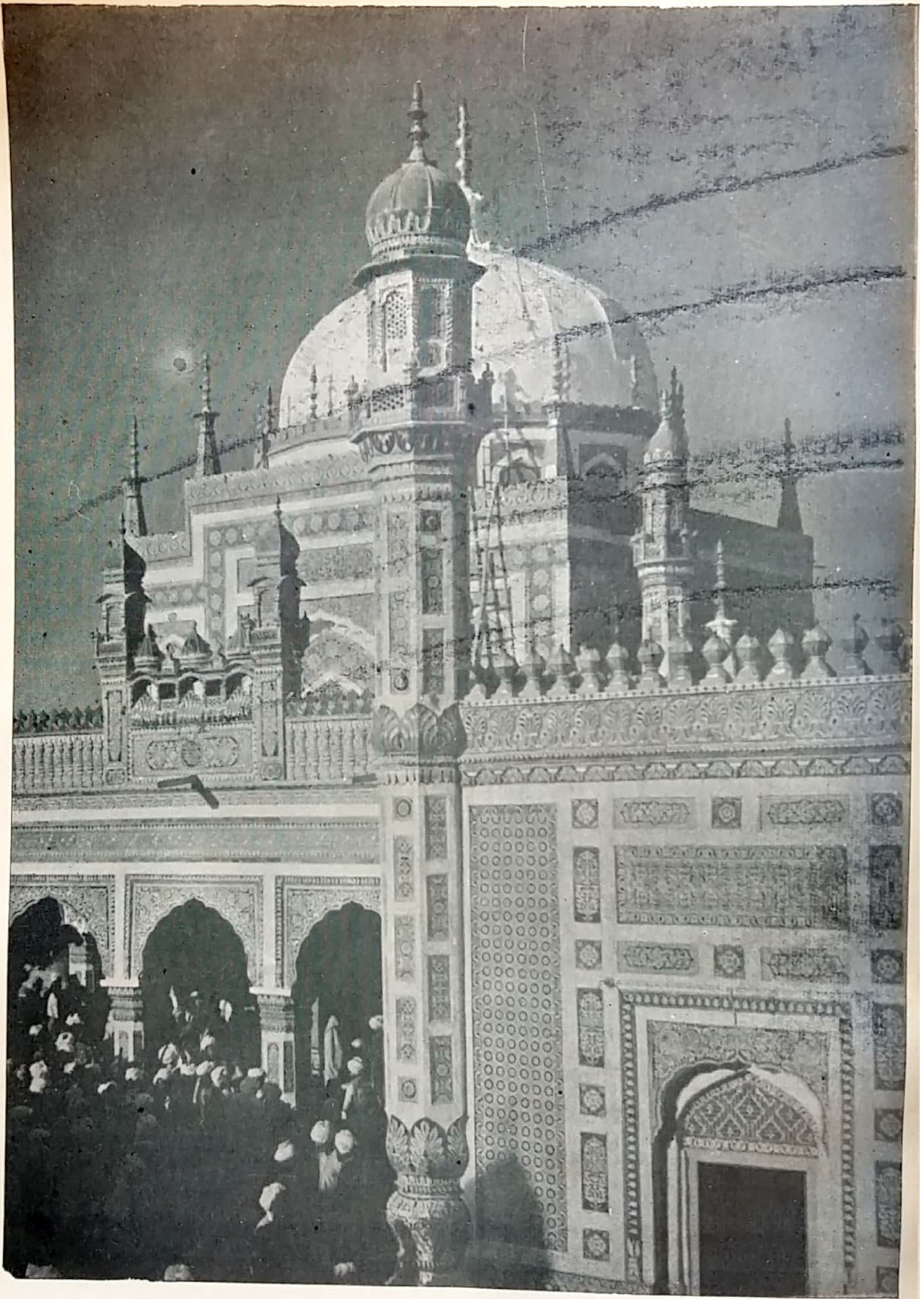
روضہ کا ایک منظر۔ مسجد کا ایک حصہ بھی نظر آ رہا ہے

مجھے ارشاد ہوا ہے کہ اردو زبان میں سید عبداللطیف بھٹائی رحمتہ اللہ علیہ کے شاعری کے متعلق عرض کروں- میرا گمان ہے کہ یہ پہلا مرتبہ ہے کہ شاہ لطیف کا نام نامی ریڈیو پر آیا ہے- پیش از آنکہ ان کی شاعری پر مختصر تبصرہ کروں- یہ ضروری ہے کہ ان کی زندگی پر سرسری نظر ڈالوں- کیونکہ کسی شاعر کے کلام کا صحیح اندازہ اس کے کوائف زندگی اور ذہنی حالات پر بہت کچھ منحصر ہے- کاش یہ بیان انگریزی یا سندہی زبان میں ہوتا- کیونکہ اردو زبان میں تبصرہ یا اسکا ترجمہ وہی شخص بخوبی کرسکتا ہے جو سندہی اور اردو دونوں زبان کا شاعر ہو- بہرحال میں اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں شاہ لطیف کی شاعری پر کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہوں- مجھے خوشی ہے کہ اہل پاکستان جن کی مشترکہ زبان اردو ہے پہلی دفعہ اس عظیم الشان شاعر کا نام سن کر ان کے غیر فانی کلام کی طرف راغب ہونگے-

جناب شاہ صاحب موصوف تقریباً سنہ ۱۶۹۰ع میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں پیدا ہوئے- اس وقت جب کلہوڑہ قوم کے افراد ملک سندہ پر حکمران تھے اور مغلوں کے باجگذار تھے- اور سنہ ۱۷۵۲ع میں وفات پائی- ظاہری تعلیم کے اولین مراحل طے کرنے کے بعد آپ نے باطنی علوم کی طرف توجہ فرمائی- اور خصوصاً تصوف کا تو پورا مطالعہ کیا- قرآن مجید- مثنوی مولانا رومی- دیوان حافظ اور رسالہ کریمی سندہ اکثر ساتھہ رہتے- ان چار کتابوں کا ان کے کلام پر گہرا اثر پایا جاتا ہے-

جوانی میں کچھہ مدت تک عشق مجازی کا آپ پر غلبہ رہا- اور اپنی عنصری محبوبہ کے فراق میں کوہ و بیاباں میں سر گرداں رہے- جوگیوں اور سنیاسیوں کے ساتھہ تیرتھہ اور زیارت گاہوں کا طواف کیا- اس سرگردانی اور پریشانی کے بعد ان کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہوا- اور عشق مجازی نے عشق حقیقی کی صورت اختیار کرلی- اور اب ان کا سارا غلو وصال ربانی کی طرف ہوگیا- صحرا نوردی کو چھوڑ کر ایک ٹھکانے پر اپنے خالق اور مالک کی یاد میں مصروف ہوگئے-

جنگل اور صحرا میں تو کیوں جاتا ہے۔ کیوں اپنے محبوب کو ادھر ادھر ڈھونڈتا ہے؟ اے لطیف! محبوب حقیقی۔ کسی دوسری جگہ نہیں چھپا ہے۔ آنکھوں کو نیچے کرکے دیکھ۔ تیرے ہی اندر دوست کا مسکن ہے"۔

مرتے دم تک اپنے خالق کی عبادات میں محو رہے۔ سماع اور سرور کے شائق تھے۔ اور انھیں کے درمیان ان کی روح پاک قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ سکرات کی سختی نہ دیکھی۔ ان کا مرقد مبارک بھٹ کے گاؤں میں واقع ہے جس پر غلام شاہ کلہوڑہ نے ایک عالیشان مقبرہ بنوایا۔ جوکہ ایک روح افزا مقام ہے۔ اور جس کے دیکھنے سے قلب کو سکون نصیب ہوتا ہے۔

اب ان کے شاعری کی طرف توجہ کرتا ہوں۔ ملک سندھ میں بہت اہل فن و اہل کمال شاعر گزر چکے ہیں۔ لیکن شاہ لطیف کا کوئی ہمسر نہیں۔ خواہ تخیل کی بلند پروازی اور رعنائی میں۔ خواہ فکر کے تعمق اور گہرائی میں خواہ کلام کی پاکیزگی اور شستگی میں۔ خواہ مضامین کے تنوع اور آراستگی میں۔ کوئی سندہی شاعر ان کے کمال تک نہیں پہنچ سکتا اگر ان کی تشبیہ عنقا یا سیمرغ سے کی جائے تو دوسرے ان کے مقابلہ میں گھریلو چڑیوں کی بھی حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ خود اپنے کلام کے بارے میں یوں فرماتے ہیں:۔

"اے لوگو! ان ابیات کو معمولی کلام نہ سمجھو۔ یہ آیتیں ہیں۔ جو انسانی دلوں کو اپنے محبوب حقیقی سے ملا دیتی ہیں"۔

جیسا کہ مولانا رومی کے مثنوی کے بارہ میں کہا جاتا ہے:۔

"ہست قرآں در زبان پہلوی"

ویسا ہی اگر شاہ لطیف کے کلام کے بارہ میں کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ کیونکہ ان کے ابیات بعض قرآنی آیات کے روحانی اسرار کی تفسیر ہیں۔

شاہ لطیف کا شمار دنیا کی عظیم الشان ہستیوں میں ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ وہ سب سے افضل اور اعلیٰ ہیں۔ دنیا کے ہر شاعر میں کچھ نہ کچھ قومی تعصب۔ مذہبی حمیت اور وطنیت کا اثر ضرور ملے گا۔ لیکن اس درویش صفت۔ فرشتہ سیرت شاعر کا زاویہ نگاہ سب کے لئے یکساں ہے۔ جب اپنے وطن سندھ کے لئے دعا مانگتا ہے۔ تو یوں کہ "اے اللہ اس کو سرسبز اور شاداب رکھ اور اپنے باران رحمت سے اس کو مالا مال کر"۔ اس دعا کے وقت وہ تمام عالم کو بھولتا نہیں۔ اور کہتا ہے۔ کہ "اے اللہ۔ سارے عالم کو آباد کر"۔

ایسا بلند پایہ شاعر ایک مدت تک گمنام رہا؟ ان کو مغرب سے روشناسی اس وقت ہوئی۔ جب ٹی۔ ایچ۔ سارلے صاحب نے ان کے کچھ منتخبات کا انگریزی نظم میں ترجمہ

شائع کیا۔ بعینہ ہمارے شاعر ملت اقبال مرحوم دنیا میں اسوقت مشہور ہوئے جب استاد نکلسن نے ان کی "اسرار خودی" کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔

بناکردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند آں عاشقان پاک طینت را

خدا تعالیٰ ہمکو توفیق دے کہ اقبال اکیڈمی کے طور پر۔ ایک اکیڈمی تاسیس کرکے اس شاعر با کمال کی ہمہ گیر خوبیوں سے عالم کو روشناس کریں۔ وہ خود فرماتے ہیں۔

"لطیف کے کلام کی آواز سارے جہاں میں گونجے"۔

شاہ لطیف کا کلام۔ سوائے چند قوافی کے۔ ابیات کے شکل میں ہے۔ لیکن ان کی جاذبیت۔ ترنم اور حلاوت کی یہ حالت ہے کہ ملک سندہ کا کوئی فرد بشر۔ چھوٹا یا بڑا ایسا نہیں جو ان کے کلام کا کوئی نہ کوئی بیت یاد نہ رکھتا ہو۔ اور اپنے نوع میں۔ خلوت میں ہو یا جلوت میں۔ ان کو گانا اور ان سے حظ اٹھانا۔ انسان کیسا ہی مغموم و رنجور کیوں نہ ہو۔ جب لطیف کا کلام سنتا ہے تو اسکا سب غم و الم کافور ہوجاتا ہے۔

ان کی جوانی کے اشعار تغزل سے پر ہیں۔ جوان ان سے بہت لطف اٹھاتے اور تمتع پاتے ہیں۔ بلکہ سن رسیدہ پر روحانی شباب کی لہر دوڑجاتی ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے۔ اول عشق مجازی کی چنگاری عارضی طور پر ان کے دامن میں سلگی۔ لیکن جلد ہی عشق حقیقی میں تبدیل ہوگئی۔ ان کی مورمیاں (ہیروئین) بظاہر مجازی معلوم ہوئیں۔ لیکن در حقیقت سب کا رخ معرفت کی جانب ہوتا ہے۔ سب کی مشابہت روح سے ہے جو اپنے اصلی منبع سے دور ہوکر۔ اس کی لامتناہی جستجو اور تلاش میں رہتی ہے۔ اور مرنے کے بعد اس سے واصل ہوجاتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر یہ وصال قیامت تک بھی میسر آئے تو باعث صد مسرت ہے۔ اس کی طلب اور تلاش ویسی ہے جیسا کہ پروانہ کی جستجو ستارہ کے لئے۔ یا رات کی دن کے لئے۔ شاہ لطیف فرماتے ہیں۔

"معرفت حقیقی حاصل کرنے کے لئے بہت سے راستے ہیں۔ کوئی بھی راہ اس کا مشاہدہ کراسکتی ہے"۔

"ایک قصر ہے۔ جس کے لاکھوں دروازے اور کروڑوں کھڑکیاں ہیں۔ جس طرف نظر پھیرتا ہوں۔ اس طرف خدا کا جلوہ ہے"۔

اینما تولوا فثم وجہ اللہ کا ترجمہ ہے۔

شاہ لطیف روحانی۔ اخلاقی۔ عشقی۔ فطری۔ بزمی۔ رزمی اور مذاقی شعر میں یکتا ہیں۔ ان کے کلام کے ہر پہلو پر روشنی ڈالنے کے لئے ایک دفتر چاہئے۔ یار زندہ صحبت باقی۔

(ماہ نو اور ریڈیو پاکستان کے شکریہ کے ساتھ)

شاہ عبداللطیفؒ کی شاعری

وقار عظیم
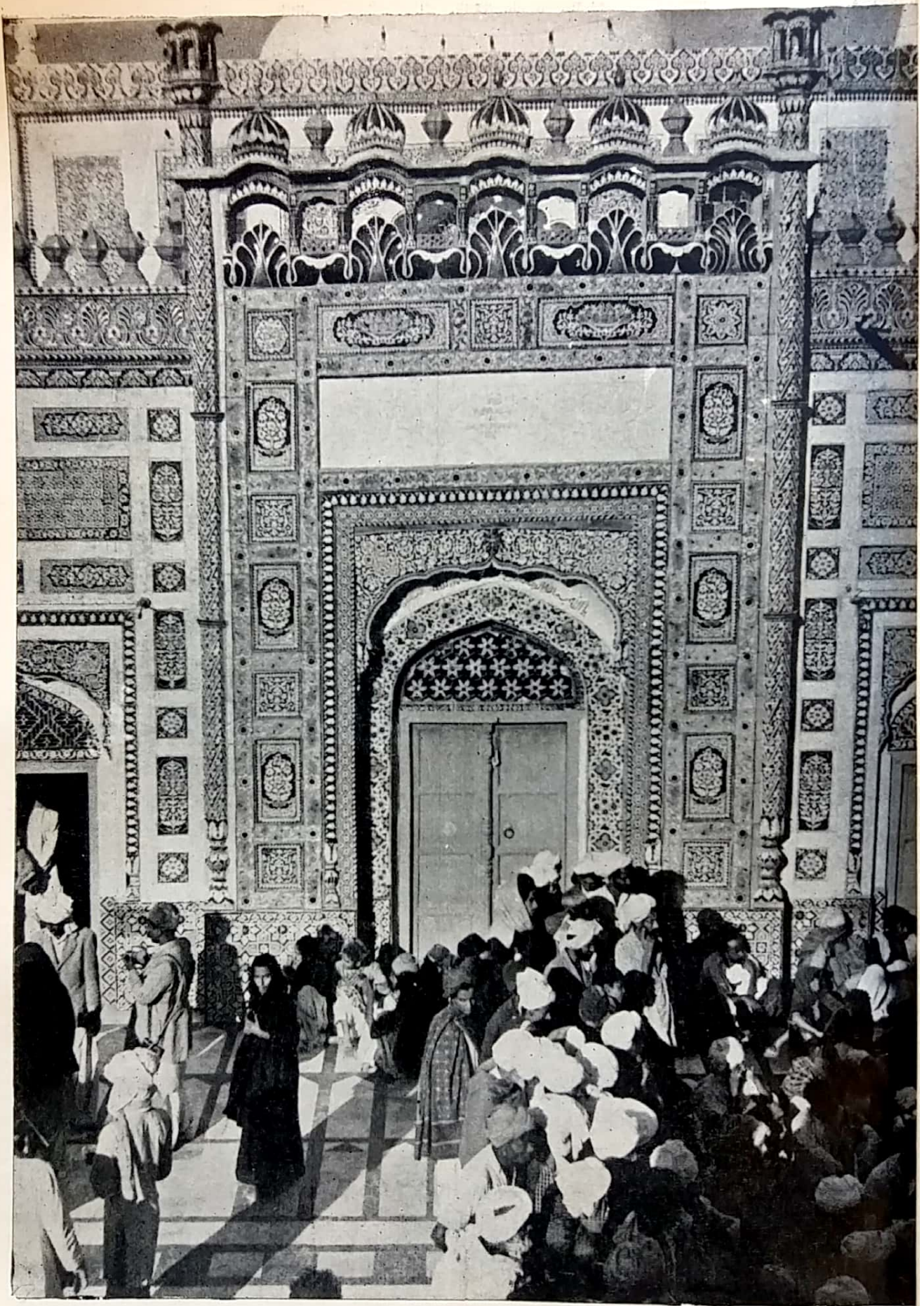
روضہ شریف کا دروازہ

حیدرآباد سندھ سے کوئی ۲۴ چوبیس میل دور بھٹ شاہ نام کی ایک چھوٹی سی بستی ہے- شہری ہنگاموں سے دور اس سیدھی سادی آبادی میں سندھ کے عظیم المرتبہ صوفی شاعر شاہ عبداللطیف کی آخری آرام گاہ ہے اور اس دور افتادہ گوشہ میں بھی شاہ عبداللطیف کی یاد کے شیدائی سال کے ہر حصہ میں آتے ہیں اور ان کی روح کو نذر عقیدت پیش کرتے رہتے ہیں- ان آنے والوں میں مذہب و ملت کی کوئی قید نہیں- شاہ کے کلام کے جادو نے ہر دل پر اثر کیا ہے ہندو- مسلمان- پارسی- امیر- غریب- خواندہ و ناخواندہ سب کے لئے اس شخصیت میں اس ذات کے پھیلائے ہوئے اخلاق میں اور اس کی میٹھی- دل میں گھر کرنے والی سچی شاعری میں بلا کی کشش ہے- یہی کشش دور دور سے آنے والوں کو سال میں ایک بار اس خاموش بستی میں لاکر اکٹھا کردیتی ہے- فروری کے مہینہ میں لوگ شاہ کا عرس مناتے ہیں- میلہ لگتا ہے اور اس میں وہ ساری چہل پہل اور گہما گہمی ہوتی ہے جس سے میلے نشاط آفریں اور رومان انگیز بنتے ہیں- - - لیکن اس سالانہ میلے کی سب سے بڑی کشش یہ ہے کہ میلے میں ہر طرف لوگ اپنے اپنے مذاق کی ٹولیاں بناکر بیٹھہ جاتے ہیں اور ہر ٹولی میں شاہ عبداللطیف کا کلام اس خاص طرز میں گاکر پڑھا جاتا ہے جیسے اب سے دو سو برس پہلے خود شاہ کے زمانہ میں- کچھہ خاص لوگ ہیں جنہیں اس کلام کو پڑھنے کا ملکہ ہے- پڑھنے والے پڑھتے ہیں اور سننے والے سر دھنتے ہیں کسی کو کلام کا صوفیانہ تخیل سرمست و سرشار کرتا ہے- کوئی اسکے نرم و نازک احساسات سے متاثر ہوتا ہے- کسی کو اس کی سادگی بھاتی ہے اور کسی کو اس میں حسن فطرت کے دلفریب جلوے نظر آتے ہیں- کوئی تخیل کی باریک بینی کا والہ و شیدا ہے اور کوئی الفاظ کی شیرینی کا- شاہ عبداللطیف کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اسے ہر مذہب و ملت کے ہر طبقے کے اور ہر مذہب کے لوگ ذوق و شوق سے پڑھتے اور سنتے ہیں- سندھ کے ہر حصہ میں لوگوں کو ان کا کلام زبانی یاد ہے اور بہت سے یاد کرنے والے ایسے ہیں کہ شاہ کے کلام کا ایک ایک لفظ ان کے دلوں کا نقش اور

زبانوں کا ورد ہے۔ جو مقبولیت سندھ میں شاہ عبداللطیف کے کلام کو حاصل ہے اس کا مقابلہ اردو میں کسی حد تک اگر کوئی شاعر کرسکتا ہے تو غالب اور اقبال۔ لیکن غالب اور اقبال کی مقبولیت ایک خاص طبقہ تک محدود ہے اور شاہ عبداللطیف کی مقبولیت کسی خاص طبقہ یا علاقہ تک محدود نہیں۔

شاہ عبداللطیف اٹھارویں صدی کے شروع کے شاعر ہیں۔ سندھ میں ان کی زندگی کے حالات کے متعلق جو تحقیق ہوئی ہے اس کی رو سے ان کا سال پیدائش سنہ ۱۶۸۹ع ہے اور سال وفات سنہ ۱۷۵۲ع۔

شاہ عبداللطیف حیدرآباد (سندھ) میں مٹیاری سے قریب ہالا حویلی کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ان کے والد حبیب شاہ اپنے زمانہ کے بڑے باعزت اور صاحب حیثیت بزرگ سمجھے جاتے تھے اور ان کا تعلق علوی سیدوں کے ایک مقتدر گھرانے سے تھا۔ لیکن شاہ عبداللطیف کو بچپن ہی سے دنیاوی جاہ و حشم سے ایک بے تعلقی سی تھی۔ ان کا رجحان دنیا سے زیادہ دین کی طرف تھا۔ عمر کا ابتدائی زمانہ ہالا حویلی میں گذرا۔ کچھ سال بعد ان کے والد ہالا سے ایک قریب ہی کے موضع کوٹری جاکر رہنے لگے تو شاہ عبداللطیف بھی ان کے ساتھ ہی گئے اور ان کے شباب کے چند برس کوٹری میں بسر ہوئے۔ عمر کے اس زمانہ سے ان کا میلان دو چیزوں کی طرف تھا۔ ۔ ۔ ۔ ایک تو یہ کہ اپنے وقت کا زیادہ حصہ صوفی منش بزرگوں کی صحبت میں گذارتے تھے۔ اور دوسرے یہ کہ اپنے فرصت کے اوقات میں ذکر و فکر میں مصروف رہتے تھے۔ تحقیق کرنے والوں نے ان کی عمر کے اس دور کے متعلق بیان کیا ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں سادگی ان کا شعار تھا۔ کھانے پینے۔ پہننے اوڑھنے اور رہنے سہنے کی ساری تفصیلوں میں وہ حد درجہ کی سادگی پسند کرتے تھے۔ محبت۔ ہمدردی۔ رحم و کرم۔ گفتگو میں نرمی اور شیرینی اور ذاتی معاملات میں انکسار و عاجزی ان کے اخلاق کی خصوصیت تھیں۔ کسی جاندار کو تکلیف میں دیکھتے تو ان کا دل تڑپ جاتا اور جس طرح بن پڑتا اس کے دکھ کا مداوا کرنے کی کوشش کرتے۔ جوانی کی عمر میں دنیاوی جاہ و حشم تک دسترس ہو اور آدمی اس سے بے نیازی برتے۔ آنی جانی دولت کو چھوڑ کر دولت ایمانی سے اپنا دامن بھرے۔ اپنے ہم جنسوں کے دکھ درد کا شریک ہو۔ خود بڑا ہوکر اپنی بڑائی پر نازاں نہ ہو تو دنیا والے اسے اپنا محبوب بناتے ہیں۔ شاہ عبداللطیف کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ لوگ ان کی طرف مائل ہوئے اور رفتہ رفتہ ان کے پرستاروں کا حلقہ بڑھنے لگا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب مٹیاری کے سیدوں کا دور و نزدیک بہت اثر تھا۔ مقامی حکمران نور محمد کلہوڑا اس خاندان کے لوگوں کے اثر سے واقف تھا اور ان کی دوستی کے دامن کو ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا۔ مٹیاری کے سیدوں نے شاہ عبداللطیف کی شہرت اور ہردلعزیزی بڑھتی دیکھی تو انہیں اپنا جاہ و حشم خطرہ میں نظر آنے لگا۔ ان سیدوں نے نور محمد خان کے کان شاہ صاحب کی طرف سے بھرنے شروع کئے اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ نور محمد خان نے مختلف طریقوں سے شاہ صاحب کی دل آزاری شروع کردی۔ لیکن انہیں اللہ کی قوت پر بھروسہ تھا۔ یہی قوت ان کا سہارا بنی اور آخر نور محمد خان کو شاہ صاحب کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑا۔

شاہ صاحب نے اپنی جوانی ہی کے دنوں میں اپنے صوفیانہ خیالات کو نظم کا لباس پہنانا شروع کردیا تھا۔ اس نظم میں اس قدر کشش تھی کہ اس نے شاہ صاحب کے حلقہ ارادت کو اور بھی وسیع کردیا اور اب دور دور ان کے روحانی نغموں کی گونج سنائی دینے لگی۔ اب تک شاہ صاحب اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتے تھے۔ لیکن انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کے روحانی نغموں کے لئے زیادہ آزاد فضا کی ضرورت ہے اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے بھٹ نامی ایک مقام پر پہونچ کر اپنے ہاتھ سے اپنا مکان بنانا شروع کیا اور اس مکان کے گرد ایک چھوٹی سی بستی بس گئی۔ اس بستی میں سنہ ۱۷۵۲ع میں ۶۳ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا اور غلام شاہ کلہوڑو نے ان کا مزار بنوایا۔ یہی مزار اب ۲۰۰ دو سو برس بعد بھی مرجع خلائق ہے۔

شاہ عبداللطیف کی حیات کا زمانہ (سنہ ۱۶۸۹ع تا سنہ ۱۷۵۲ع) یعنی سترھویں صدی کا آخر اور اٹھارویں صدی کا نصف اول سندھ کی تاریخ کا بے حد اہم دور ہے۔ یہی زمانہ ہے جب سندھ کی حکومت رفتہ رفتہ مغلوں کے ہاتھوں سے خود سندھی حکمرانوں کے ہاتھ میں آرہی تھی۔ کلہوڑو خاندان کی قوت بڑھنی شروع ہوگئی تھی اور سندھ نے سیاسی آزادی کی فضا میں سانس لینی شروع کردی تھی۔ جب اورنگ زیب کا انتقال ہوا تو عبداللطیف کی عمر ۱۸ سال کی تھی۔ اس کے بعد کلہوڑو خاندان کی قوت تیزی سے بڑھنی شروع ہوئی اور اس نئی آزادی کے کرشمے شاہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا اور سندھ کو فارس کا باجگزار بنایا تو شاہ کی عمر ۵۰ سال تھی۔ اس کے آٹھ سال بعد جب احمد شاہ درانی نے دہلی کی دم توڑتی ہوئی سلطنت پر حملہ کرکے سندھ کو کابل کی مملکت کا مطیع بنایا تو شاہ ۵۸ سال کے تھے۔ اس کے پانچ سال بعد شاہ کا انتقال ہوا۔

سیاسی اور تاریخی نقطہ نظر سے شاہ عبداللطیف کی زندگی کا پس منظر انتشار اور آزادی کا ایک ملا جلا مرقع تھا۔ ان کے گرد و پیش کی زندگی سیدھے سادے دیہاتیوں کی زندگی تھی۔ - - ایسے دیہاتی جو زرخیز زمینوں میں کاشت کرتے۔ بھیڑوں بکریوں اور بیلوں کے گلوں کی پاسبانی کرتے اور اونٹ پالتے اور اس مرنجان مرنج۔ آہستہ خرام لیکن جفاکش چوپائے کی طرح صحرا کی تپتی ریت اور سورج کی تیز شعاعوں میں اپنا وقت کام کاج میں گزارتے۔ اپنے کھیتوں میں بیج بوتے اور دریائے سندھ کی بڑھتی گھٹتی رو کے سہارے ان بیجوں میں پانی دیتے اور پھر اللہ کے رحم کے منتظر رہتے کہ وہ ان بیجوں

بھٹ سندھی میں ریت کے ٹیلے کو کہتے ہیں۔ ہوائیں ریگستان کے علاقوں سے جو ریت اڑاکر لاتی ہیں ان سے جا بجا ٹیلے سے بن جاتے ہیں۔ بھٹ اسی قسم کی ایک جگہ تھی۔

کلہوڑو خاندان کے بادشاہوں کی نسل اصل میں چانو سندھیوں سے ملتی ہے جو پہلے ہندو تھے۔ لیکن بعد میں مسلمان ہوگئے تھے۔ جب سندھ میں ان کی قوت بڑھی تو انھوں نے یہ دعویٰ شروع کردیا کہ وہ بنی عباس سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اپنے جور و ستم کے باوجود اپنے اس دعویٰ کا ثبوت مہیا نہیں کرسکے۔ سندھ میں باقاعدہ حکمرانوں کی حیثیت سے ان کا اقتدار سنہ ۱۷۲۶ع میں قائم ہوا لیکن مقامی حکومت کے امور میں ان کا عمل دخل اس سے کوئی نصف صدی پہلے شروع ہوچکا تھا۔

سے پودے اگائے اور پودوں میں سنہری بالیں نکلیں۔ ان سادہ لوح دیہاتیوں کی زندگی میں مادیت اور روحانیت ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں تھیں۔ زندگی کی کامیابی اور خوشحالی میں جہاں ایک طرف خود ان کی جفاکشی کا ہاتھ تھا دوسری طرف دست مشعیت کا سہارا بھی تھا اور اسلئے ان کا ہر قدم گو فطرت کے تقاضے سے اٹھتا تھا۔ لیکن مشعیت کی مرضی کا محتاج تھا۔ ان دیہاتیوں کی روزآنہ زندگی میں طرح طرح کے چوپائے ان کے ہم عنان اور ہم سفر تھے اور مظاہر قدرت ان کے معین و مددگار۔ اسلئے ان کے دلوں میں ان کی محبت اور عزت تھی اور وہ ان کے عشق و محبت میں بھی ان کے ہمراز تھے۔ یہی دیہاتی جب اپنے کاموں سے فارغ ہوتے تو فرصت کے وقت کو اللہ کی دی ہوئی ایک بڑی نعمت سمجھ کر اس کی قدر کرتے۔ گاتے بجاتے۔ اپنے دیس کی عشق و محبت کی کہانیاں مزے لے لے کر سنتے سناتے۔ ان میں نغمہ کا رنگ بھرتے اور قدیم روایتوں کو حیات جاوید بخشتے۔ فرصت کا ہر وقت اور تہوار کا ہر دن۔ عید۔ بقرعید۔ ہولی۔ دیوالی ان خوشیوں کیلئے وقف تھا۔ اور ان کی زندگی میں لوگ گیتوں اور ان لوک گیتوں کی گود میں پلی ہوئی موسیقی کا بڑا حصہ تھا۔ شاہ عبداللطیف نے اپنی ساری زندگی انہیں دیہاتیوں میں گذاری۔ گھروں کے اندر اور گھروں سے باہر ان کی مادی و روحانی اور جذباتی زندگی میں جن چیزوں کی گہری جگہ تھی ان کا مطالعہ کیا۔ ان کی ذہنی سطح اور اخلاقی ضرورتوں کا اندازہ لگایا اور پھر ان ہی میں رہ کر ان کے لئے خیالات کو نغمہ کے پیرہن میں پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ عبداللطیف کی شاعری (جسے اس کی ہئیت اور روح کے اعتبار سے نغمہ کہنا زیادہ موزوں ہے) میں ہر جگہ ان کے دلوں کی دھڑکن موجود ہے۔ اس کا موضوع وہی لوک کہانیاں ہیں جو ان کے بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ انہیں مناظر کا ذکر ہے جو ان کی زندگیوں پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ وہی اشارے اور تشبیہ اور استعارے ہیں جو ان کے دلوں سے قریب ہیں۔ انہیں کی سادگی زبان ہے۔ شاعر نے ایک اچھے فنکار کی طرح یہ کہا ہے کہ ان بہت سی بکھری ہوئی چیزوں میں سے صرف ان کا انتخاب کیا ہے جن سے ان کے نغمہ میں سرمستی پیدا ہوتی ہے۔ اس نے تفصیلوں کی جگہ اشاروں سے کام لیا ہے۔ پوری کہانی سنانے کے بجائے صرف اس کے وہ ٹکڑے لے لئے ہیں جن کی کوئی جذباتی اہمیت ہے۔

شاہ عبداللطیف کے کلام کی بنیاد ان کا صوفیانہ انداز نظر ہے لیکن اس صوفیانہ فکر کیلئے انہوں نے سترھویں صدی کے آخر اور اٹھارویں صدی کی دیہاتی زندگی کے مادی اور جذباتی پہلوؤں کے پیکر سے مدد لی ہے اور اس عہد کی زندگی میں ظاہری اور باطنی۔ حقیقی اور روایتی جتنے رخ تھے سب پر نظر رکھ کر اپنے گیتوں کا تانا بانا تیار کیا ہے اس لئے گو ان کے خیالات سر تا سر صوفیانہ ہیں لیکن ان صوفیانہ خیالات میں تصوف کی خشکی کے بجائے ایک صحت مند تازہ۔ شگفتہ اور سچے عشق کی ولولہ انگیزی ہے اس تصوف میں فلسفہ نہیں۔ رومان ہے اور اس رومان میں وہی سب کچھ ہے جس سے رومان کی داستان سننے والوں کیلئے بھی حیات بخش بن جاتی ہے۔ یہ عشق دنیاوی عشق کی آلائشوں سے پاک۔ روحانی ہے لیکن حقیقت اور صداقت کی بنیادوں پر قائم۔ شاہ عبداللطیف کی شاعری کا بنیادی جذبہ اسلامی تصوف ہے لیکن انہوں نے اس تصوف

کو اپنے عہد کی زندگی اور اس عہد میں پھیلی ہوئی محبوب روایات کے قالب میں ڈھال کر اسے عوام کے ذہن سے قریب کردیا ہے اور سندھی پڑھنے والے اس شاعری کو اپنی حیات اجتماعی کا مرقع گرد و پیش کے مظاہر فطرت کا آئینہ اور شخصی جذبات و محسوسات کا سچا ترجمان سمجھ کر اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ انہیں شاہ عبداللطیف کی ہر بات اپنے دل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ میں ان کی اپنی مانوس زندگی کی جھلک ہے۔ وہ انہیں ماضی کی روایات کی یاد دلاتی ہے۔ محبوب لوک گیتوں اور لوک کہانیوں کی دنیا کو سیر کراتی ہے۔ اور پھر اپنی ہی دنیا میں رکھ کر بلند اخلاق کے درس دیتی ہے۔ اس لئے شاہ عبداللطیف سندھی کے سب سے ہردلعزیز شاعر ہیں۔

لیکن سندھی کے اس صوفی شاعر کے کلام کی ان مقامی خصوصیات میں فن کی لطافتوں کا اتنا متوازن امتزاج بھی ہے کہ اصل زبان نہ جاننے والا ان کے ترجمے پڑھتا ہے تو اس کے دل پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے۔ سندھی زندگی کے جن پہلوؤں کی طرف شاہ کے کلام میں اشارے ہیں اور جن اخلاقی نکات کی ان اشاروں اور کنایوں میں تعلیم ہے وہ بے حد تصور آفرین ہے اور پڑھنے والے کو ایک وضع ذہنی تصویر بنانے میں مدد دیتی ہے۔ پڑھنے والا تخیل کی نزاکت اور معنی آفرینی پر سر دھنتا ہے اور ایک خاص طرح کے ماحول کا نقشہ بھی اس کی نظر میں پھر جاتا ہے۔ اگر غور سے دیکھئے تو اس ماحول میں آپ کو زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی چیز دکھائی دیگی اور پھر اس چھوٹی سے چھوٹی چیز کا ایک وسیع مفہوم ہوگا۔ کبھی جذباتی کبھی اخلاقی اور کبھی سماجی اور معاشی۔ - - مثال کے طور پر شاہ کے کلام کو پڑھ کر بیرونی زندگی کی ایک تصویر بنائیے تو اس کا انداز کچھ اس طرح کا ہوگا۔

ریت کے چمکیلے ذروں کی گود میں ایک چوڑا چکلا دریا مچل رہا ہے۔ کبھی جوش میں آتا ہے تو اپنے دائیں بائیں میلوں زمین کو سیراب کرتا چلا جاتا ہے اور کبھی آس پاس کی زمینیں آس لگائے بیٹھی رہتی ہیں اور وہ بے نیازی سے آگے گزر جاتا ہے۔ کہیں سیدھا چلتے چلتے اپنا رخ بدل دیتا ہے اور خشک زمینوں میں کھڑے ہوئے گڑھے تالاب بنجاتے ہیں۔ ان تالابوں میں گھڑیال ہیں جو دھوپ کھانے کو ریت پر آ پڑتے ہیں اور انسان کی جان کیلئے خطرہ کا ایک نیا سامان پیدا ہوجاتا ہے۔ دریا کے کنارے گھاٹ ہیں ان میں رسیوں سے کشتیاں بندھی ہوئی ہیں۔ سوداگر اپنا سامان باندھتا ہے اور اس کشتی میں لادکر کسی دور کے دیس کو لے جاتا ہے۔ جب وہ اپنا سفر پورا کرکے واپس آتا ہے تو دریا کے کنارے کھڑی ہوئی دوشیزہ اس کے بادبانوں کے رنگ سے پہچان لیتی ہے کہ وہ اس کے محبوب کی کشتی ہے۔

زندگی کی ایک دوسری تصویر بارش لانے والے بادلوں کی آمد سے وابستہ ہے۔ بادل آتے ہیں۔ بجلی چمکتی ہے۔ بوندیں پڑتی ہیں۔ جل تھل ہوجاتے ہیں اور ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ سب خوش ہیں لیکن بارش کی کثرت نے مہاجن کے سارے منصوبوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ اب وہ غلہ پانچ گنے داموں پر کیسے بیچے گا۔ پھر شمال کی طرف سے تلوار کی طرح کاٹنے والی خشک ہوائیں چلتی ہیں اور جھونپڑیوں

کے سر پر سیٹیاں بجاتی اور گھاس کے سبز پتوں کی نوکوں کو مرجھاتی ہوئی آگے نکل جاتی ہیں۔ کبھی ریگستان کی پھیلی ہوئی بے خبر گود میں سورج کی کرنیں اترتی ہیں اور ریت کے ٹیلوں کو آگ کی بھٹی بنادیتی ہیں اور مہجور دوشیزہ اس تپتی ہوئی ریت میں اپنے محبوب کی تلاش کی سختیاں جھیلتی ہے اور ان مختلف مناظر میں بگلے۔ کوئے۔ گرجھ اور لوئے اپنے اپنے روایتی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔

گھر کے اندر کسان آنے والی بارش کے انتظار میں اپنے ہل جوڑ رہا ہے۔ مٹکی میں رکھی ہوئی چھاچ میں جھاگ اٹھر ہے ہیں اور چرخے کی دھیمی آواز پس منظر کی موسیقی پیدا کر رہی ہے۔ عورتیں چرخہ کاتتی جاتی ہیں اور گاوں کی باتیں کرتی جاتی ہیں اور گاوں کے باہر دور سے مویشیوں کی گھنٹیوں کی آواز آرہی ہے۔

سیٹھ اپنے فاخرہ لباس میں گھوڑے پر تنا بیٹھا ہے اور غرض مند غریب نے اس کی رکابیں ہاتھ سے پکڑ رکھی ہیں۔ امیروں کے گھروں میں عورتوں نے سروں میں تیل ڈال کر آنکھوں میں سرمہ لگایا ہے اور ان کے گلے میں طوق اور ہاتھوں میں کنگن ہیں اور غریب عورت کے جسم کا کپڑا سو جگہ سے پھٹا ہوا ہے۔

شادیاں ہوتی ہیں۔ لوگ جمع ہوتے ہیں۔ گانے بجانے ہوتے ہیں۔ مطرب اپنے ساز طرح طرح بجاتا ہے اور اس پر اپنے نغمے گاتا ہے۔۔۔ ہر طرف فقیروں کا دور دورہ ہے لوگ ان سے مرادیں مانگتے ہیں اور اپنے محبوب سے بچھڑی ہوئی دوشیزہ کڑکڑاتے جاڑے کی اندھیری رات میں دروازے سے لگی صبح کا انتظار کر رہی ہے کہ اس کا شوہر صبح آنے والا ہے۔

اس طرح کی پچاسوں تصویریں شاہ عبداللطیف کے کلام میں ہیں جس میں ان کیلئے بھی کشش ہے جو ان تصویروں سے مانوس ہیں اور ان کیلئے بھی جنہوں نے کبھی یہ تصویریں اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھیں۔

شاہ عبداللطیف کا یہ سارا کلام ایک مجموعہ کی سکل موہں مرتب ہوچکا ہے اور شاہ عبداللطیف کے رسالے کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ سندھ کے سب سے محبوب شاعر کے کلام کا یہ مجموعہ بازار میں کہیں نہیں ملتا۔ جو تھوڑے بہت نسخے اس وقت تک مرتب ہوکر شائع ہوئے ہیں وہ بھی شاہ صاحب کے کلام سے گہری دلچسپی رکھنے والے گنے چنے علم دوست حضرات کے ذاتی کتب خانوں کی زینت ہیں۔ اب تک جتنے نسخے مرتب و مدون ہوئے ان کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

(۱) شاہ کے کلام کا سب سے پہلا نسخہ ان کی وفات کے چالیس سال بعد ان کے ایک مرید نے مرتب کیا تھا۔ یہ نسخہ لوانری والا نسخہ کہلاتا ہے اور رسالے کے سارے نسخوں میں سب سے زیادہ مستند ہے۔ (۲) لوانری والے نسخہ کے ۶۰ سال بعد ایک اور نسخہ مرتب ہوا۔ یہ بھٹ والا نسخہ کہلاتا ہے۔ (۳) تیسرا نسخہ سندھ کے شاعر میر عبدالحسین والا مرتب کیا ہوا ہے۔ چونکہ میر صاحب نے جا بجا متروک الفاظ نکال

بسم الله الرحمن الرحيم

اول الله عليم اعلى عالم جو ڌڻي ۔ قادر پهنجي
قدرت سين قائم آهه قديم ۔ والي واحد وحده رازق رب
رحيم ۔ سو ساراهه سچو ڌڻي جي حمد حڪيم ۔ ڪري
پان ڪريم جوڙ جوڙ جهان جي بيت وحده لاشريڪ
له جا ستو جي اننن ۔ تان منجهه محمد ڪارڻ نرتو منجهانئه
تان تن مڃو ڪين ناني سر پنڪي بيت وحده لاشريڪ

میر عبدالحسین تالپور سانگھی کے قلمی نسخے کا پہلا صفحہ

کر مروج الفاظ شامل کردئے ہیں اسلئے یہ نسخہ مستند نہیں سمجھا جاتا۔ اس رسالہ کا ایک نسخہ حکومت سندھ کے ایماء پر بمبئی میں شائع ہوا۔ اس نسخہ میں شاہ صاحب کا مکمل کلام موجود ہے۔ (۴) ایک نسخہ سنہ ۱۸۶۰ع میں جرمنی میں چھپا۔ اسے (Trump) والا نسخہ کہتے ہیں۔ (۶) چھٹا نسخہ تارا چند ذوتی رام کا ہے۔ (۷) ساتواں مرزا قلیچ بیگ کا۔ اس نسخہ میں مرزا قلیچ بیگ نے مرتبہ اور مطبوعہ کلام کے علاوہ بہت سی ایسی چیزیں بھی شامل کردی ہیں جو سینہ بہ سینہ اس زمانہ تک پہونچی ہیں اور شاہ عبداللطیف کے نام سے منسوب ہیں۔ (۸) آٹھواں نسخہ ڈاکٹر گربخشانی کا ہے۔ ڈاکٹر گربخشانی نے کلام کی ترتیب و تدوین میں بڑی کاوش اور تحقیق سے کام لیا ہے لیکن ان کا مرتب کردہ کلام شاہ کا پورا کلام نہیں۔ (۹) ایک نسخہ عثمان علی انصاری صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اس کے تھوڑے تھوڑے حصے سندھی ادب کے مرکزی اڈوائزری بورڈ آف کنٹرول کے رسالہ مہران میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

شاہ عبداللطیف کی شاعری کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے انسان کو تین چیزوں کے علم اور مہارت کی ضرورت ہے۔ تصوف کا علم سندھی زبان کی مہارت اور سندھی زندگی کی تفصیلات سے پوری واقفیت۔ تصوف کے متعلق میرا علم محض نظری ہے۔ وارداتی نہیں۔ سندھی زبان کے علم میں میری حیثیت مبتدیوں سے بھی کچھ کم ہے۔ زندگی کی تفصیلات کی واقفیت کیلئے بھی میں دوسروں کے علم کا محتاج ہوں۔ اس کے باوجود شاہ عبداللطیف کی شاعری پر کچھ کہنے کی جسارت صرف اس عذر کی بناء پر کر رہا ہوں کہ اردو والے اب تک سندھ کے اس صوفی شاعر کے کلام سے روشناس نہیں ہیں۔

شاہ عبداللطیف کے کلام کو سمجھنے اور ان کے شاعرانہ محاسن سے لطف اندوز ہونے کیلئے ہمیں یہ چیز ہر وقت ذہن میں رکھنی پڑتی ہے کہ شاہ صوفی شاعر ہیں اور تصوف اور شعر اس حد تک ان کی ذات اور شخصیت کا جزو بن گئے ہیں کہ پڑھنے والے کلام کے کسی حصہ کے متعلق بھی آسانی سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ محض تصوف یا محض شعر ہے۔ تصوف اور شعریت ان کے یہاں ایک ہی زنجیر کی دو کڑیاں ہیں۔ ان کا ہر خیال اور ہر جذبہ تصوف کے رنگ میں ڈوب کر باہر نکلتا ہے اور شاہ کی شخصیت کا دوسرا عنصر (یعنی شعریت) اسے اپنے قالب میں ڈھال لیتا ہے۔ یہاں ہر جگہ تصوف ہے اور ہر جگہ شعریت ہے۔ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے پر غالب نہیں آنے پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ کے کلام کو اگر موضوع کے اعتبار سے مختلف حصوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی جائے تو بڑی دقت پیش آتی ہے اسلئے کہ اس تقسیم کا معیار خواہ کچھ بھی ہو تصوف کی چاشنی اس میں بہرحال موجود رہتی ہے اور اس لئے شاہ کے نقادوں نے جب ان کے کلام کی تقسیم کرنے کی کوشش کی ہے تو انہیں مختلف قسم کی معذرتیں پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ پھر بھی مجموعی حیثیت

سے جس بات پر اکثر نقاد اور شارح متفق ہیں وہ یہ بات ہے کہ ان کے کلام کا ایک حصہ دعائیہ ہے جسے عاشقانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس میں سندھی زندگی کا پس منظر ہے۔ اور تیسرا حصہ وہ ہے جس میں مروجہ لوک کہانیوں کے ٹکڑے نظم کئے گئے ہیں۔

دعائیہ یا عاشقانہ کلام میں عشق و محبت کے وہی سارے مدارج اور وہی ساری کیفیات ہیں جو عموماً عاشقانہ شاعری میں ہوتی ہیں۔ حسن بے نیاز ہے۔ عشق بے تاب و بے قرار ہے لیکن فرق یہ ہے کہ گو عشق کی ساری علامتیں دنیاوی ہیں لیکن ان کا احساس بلند روحانی احساس ہے۔ اس میں ارضی عشق کی تنگ نظری اور تنگ ظرفی کہیں نہیں۔ محبوب سے شکوہ شکایت کا نام نہیں۔ لہجہ میں سختی۔ کرختگی۔ حتیٰ کہ طعن طنز سرے سے مفقود ہے۔ بات چونکہ ہمیشہ عورت کی طرف سے کی گئی ہے اسلئے قدرتی طور پر اس میں ایک طرح کی نرمی نزاکت اور لوچ ہے۔

شاہ کی محبت میں عاشق اور محبوب کے کردار کی دو خصوصیات ہیں اور ان کے ہر عمل میں یہ خصوصیات جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ عشق اپنے آپ کو برائیوں کا مجسمہ جانتا ہے اور حسن اس کی نظر میں مجسم حسن ہے۔ اس بنیادی خیال کو شاہ نے اپنے کئی دوہوں میں ادا کیا ہے۔ دو تین دوہے ملاحظہ کیجئے۔

"میرے محبوب کی پیشانی سے نیکیوں کے انوار ہویدا ہیں۔ یہی وجہ تو ہے کہ وہ مجھ جیسے بد اطوار کے پاس آنے سے گریز نہیں کرتا۔ اسی لئے تو میں اپنے دوستوں سے کہتا ہوں کہ شمس و قمر میرے محبوب کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ ان میں حسن تو ہے لیکن نیکی نہیں۔"

"میرا محبوب مجسم خیر ہے اس نے یہ بات بالکل بھلادی ہے کہ وہ نیکیوں سے پر ہے۔ اس کی نیکی اور معصومیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ میرے پاس آیا۔ لیکن اس نے مجھ سے میرے عیبوں اور میری کوتاہیوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔"

"اے چاند تو میرے محبوب سے مقابلہ کرتا ہے۔ میں تجھے للکارتا ہوں----- تو چودھویں رات کو جو سنگھار چاہے کر۔ ساری عمر کا حسن اکٹھا کرلے لیکن میرے محبوب کے ایک جلوے کی برابری بھی نہیں کرسکتا۔"

"تم اور تمھارے جیسے ایک سو سورج نکل آئیں پھر بھی محبوب کے بغیر میرے لئے اندھیرا رہیگا۔ جاو۔ نیچے اتر جاو----- تمھاری روشنی میں میں محبوب سے نہیں ملنا چاہتا۔"

یہ تو ہے محبوب کا تعارف-----اب دیکھئے کہ عاشق کے دل میں عشق کے دئیے ہوئے درد کی کتنی محبت ہے۔

"وہ میرے دل میں درد اٹھاکر چلے گئے- اور مجھے یہ درد اسلئے پیارا ہے کہ وہ محبوب کا دیا ہوا ہے اس لئے مجھے طبیبوں کی آواز بھی بری لگتی ہے-"

"مجھے طبیبوں کے پاس بیٹھنا بھی گوارا نہیں- اسلئے کہ میرا سب سے بڑا دوست تو محبوب کا دیا ہوا درد ہے-"

یہ درد عاشق کو اتنا عزیز ہے کہ محبوب سے استدعا کرتا ہے کہ وہ اسے جسطرح بھی ہو یہ درد دے- دیکھئے دو تین دوہوں میں شاعر نے عاشق کی اس تمنا کو کتنے جوش- ولولے اور ارمان کے ساتھ بیان کیا۔

"اے میرے محبوب لگاو- زور سے لگاو- آہستہ لگاکر مجھ پر احسان مت کرو- اسلئے کہ یہ مجھ پر احسان نہیں- میرے لئے تو عزت کی بات یہ ہے کہ تمھارے دئے ہوئے زخم سے مرجاوں-"

"اے میرے محبوب- چوٹ لگاو اور جتنے زور سے ہوسکے لگاو- تاکہ مجھے تمھاری جھولی میں گرجانے کا موقع مل جائے-"

"ان کا دیا ہوا زخم مجھ سے سدا یہی کہتا رہتا ہے کہ طبیب کے پاس مت جا ورنہ میں اچھا ہوجاونگا-"

عشق کی دنیا میں تصویر کا ایک رخ تو وہ ہے جس میں شاعر عاشق کی روداد بیان کرتا ہے اور دوسرا وہ جس میں ان لوگوں کی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے جو عشق کے میدان میں اس کے مد مقابل اور رقیب ہیں- جس عشق کی پرورش بوالہوسی کے گہوارہ میں ہوتی ہے وہ عشق کی رقابت کی تاب نہیں لاسکتا- لیکن جس عشق میں لگاو سچا ہے وہ اس تنگ ظرفی کو پاس بھی نہیں آنے دیتا- اسے تو ان ہم جنسوں اور ہم چشموں کی صحبت اور بھی عزیز ہوتی ہے جن کے دلوں میں محبوب کا دیا ہوا درد ہے۔

"آو چلیں- ایک رات ان کے پاس گذاریں جن کے جسم درد سے چاک ہیں- لیکن جب لوگ آتے ہیں تو ان سے اپنا درد چھپاتے ہیں-"

شاہ کے کلام میں عاشق کا کردار بہت بلند ہے- اس میں ایک طرف حسن کا بہت اونچا نصب العین ہے دوسری طرف عشق کا نصب العین بھی۔اسی طرح اس سے کم تو نہیں- حسن کی بلندی یہ ہے کہ وہ دنیا کے ہر حسن سے بہتر و برتر ہے- ایسے حسن کیلئے عشق بھی ایسا ہی بلند ہونا چاہئے- وہ محبوب کے حسن کا فریفتہ ہے- اسے اس میں نیکیوں کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا- اس کے دئے ہوئے درد میں اسے باقی ہر چیز سے زیادہ لذت محسوس ہوتی ہے- اسے ان عاشقوں کی صحبت میں رہنے کی تمنا ہے جو اس کے

رقیب ہیں لیکن اسی حسن کے عاشق ہیں جس کے جلوے اس کی نظر میں سمارہے ہیں۔ اسی نازک رشتہ کی دو ایک کڑیاں اور ملاحظہ کیجئے۔

"کسی نے پوچھا۔ تمھارا محبوب کبھی تم سے بات کرتا ہے"۔

"نہیں"۔

"پھر وہ محبوب کیسا"۔

"محبوب کا سکوت ہی میرے لئے سلام ہے"۔

"میری آنکھوں نے مجھ پر احسان کیا کہ میرے گھر کے سامنے سے ہزاروں انسان گذرتے ہیں لیکن وہ کسی کو نہیں دیکھتیں"۔

"میری آنکھیں اگر محبوب کے سوا اور کسی کو دیکھیں تو اے کاگا ان کو نکال کر گڑھے میں ڈال دے"۔

یہ ایک جھلک ہے۔ شاہ کے عاشقانہ یا دعائیہ کلام کی۔ کلام کے دوسرے حصہ میں ہمیں سندھی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی بہت سی دلکش تصویریں نظر آتی ہیں۔ مثلاً بارش کے موضوع پر شاہ نے ایک طرف تو اس عام ذہنی کیفیت کی مصوری کی ہے جو سندھ جیسی بنجر زمین میں بارش ہونے پر ہر ایک دل میں پیدا ہوتی ہے اور پھر اس پھیلی ہوئی زندگی میں سے کچھ خاص کردار چن کر اس تصویر کو مکمل بنادیا ہے۔

"دیکھو لطیف گھنے بادل نیچے اتر رہے ہیں اور پانی کی بڑی بڑی بوندیں پڑنے لگیں۔ اپنے بیلوں کو باہر نکالو اور میدانوں کا رخ کرو----یہ وقت مایوس ہوکر بیٹھنے اور سستی کرنیکا نہیں----- لو دیکھو۔ پھوہار پڑنے لگی"۔

"کل رات پدم جھیل پر بارش کے دیوتا نے گڑھے کے گڑھے انڈیل دئے لیکن وہ جن کے شوہر پردیس میں ہیں۔ ان بادلوں کو دیکھکر غمگین ہیں"۔

"وہ موسم آگیا جب لوگ خوش ہوکر باتیں کرتے اور موسیقی کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ کسان اپنے ہل درست کر رہے ہیں۔ گلہ بان خوش ہیں اور میرے محبوب نے بارش کی خوشی میں اچھے سے اچھے کپڑے پہنے ہیں"۔

"جو لوگ قحط کے سہارے پر جیتے ہیں اور جو لوگ کنجوس ہیں ان سے کہو کہ چلے جائیں۔ گایوں کے گلے بارش کی خبر لارہے ہیں------سب تیری رحمت کو اپنے قریب محسوس کر رہے ہیں"۔

سندھی زندگی کی جن خاص رسموں کو شاہ نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے رسالہ کا ایک باب جسکا نام "سر سامنڈری" ہے۔ ان رسموں میں سے ایک کے مختلف پہلوؤں کا ترجمان ہے۔ سمندر کے کنارے بسے ہوئے گاوں میں بہت ہندو آباد تھے۔ یہ سمندر کے راستے تجارت کی غرض سے دوسرے ملکوں کو جاتے تھے۔ رسم یہ تھی کہ جو

نوجوان تجارت کیلئے جانے والا ہوتا اسکی شادی روانگی سے ایک ہفتہ پہلے کردی جاتی تھی- اسوقت اسکا جانا سب سے زیادہ شاق اس کی نئی بیوی پر گزرتا تھا- شاہ نے اس نئی بیوی کی زبان سے اس کی دلی کیفیات کا جو اظہار کیا ہے اس کے مختلف موقع پر سر سامنڈری میں ہیں- کچھ تصویریں دیکھئے۔-

"سہیلی نے اس سے پوچھا- تم آج سمندر پر نہیں آئیں- اس نے جواب دیا- "اے سکھی! اس پردیسی چڑیا نے جو زخم میرے دل پر لگائے تھے وہ ابھر آئے تھے------کیونکہ صبح کو ایک بادبان نظر آیا تھا"-

"سہیلی نے اس سے کہا- تم نے اس سے یہ کیوں نہیں کہا- اگر تمہاری محبت اس کشتی پہ سفر کے ساتھ تھی تو پھر مجھ سے یہ ناطہ کیوں جوڑا------ اور اگر اس سے یہ نہ کہہ سکی تو خود اپنے آپ سے کہہ لیتی کہ ان کشتی میں جانے والوں سے محبت نہیں کی جاتی"-

"اگر تم مجھ سے بھلائے نہیں جا سکتے تو اللہ کرے میں بھی تمھیں یاد رہوں- کیونکہ نگینہ تو انگوٹھی کے بغیر بالکل بیکار ہے"-

"آج پھر ایک جہاز جا رہا ہے- میرا جانے والا پریتم- میں ہزار روکوں- پھر بھی وہ نہ رکیگا- اے میری ماں- جس کی محبت سمندر کی سیر ہے- اسے کہاں تک روک سکونگی- جب میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں کہ لنگر بھی اٹھالیا گیا ہے"-

اس طرح ایک دوسرا باب "سر کاپائتی" ہے- سر کاپائتی کے سارے دوھے اس خاص رواج کا پس منظر پیش کرتے ہیں کہ ان دنوں لڑکیوں کیلئے چرخہ چلانا اور سوت کاتنا ایک ہنر کی بات سمجھی جاتی تھی- یہاں تک کہ لڑکیوں میں سوت کاتنے کے مقابلے بھی ہوتے تھے- اس سر میں شروع سے آخر تک شاہ کے صوفیانہ تخیل کا بہت گہرا پرتو ہے- انہوں نے چرخے اور سوت سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کو ایک کنیا کی صورت دیکر بظاہر ایک سیدھے سادے انداز میں تصوف کا کوئی نہ کوئی نکتہ بیان کیا ہے----خصوصاً عمل اور حسن عمل کے بارے میں صوفیا کا جو نقطہ نظر ہے- اس کی وضاحت اس سر پہ اکثر دوھوں میں ہوتی ہے۔-

"تمھیں کاتنے سے ذرا بھی دلچسپی نہیں- تمھیں تو بس سونا چاہئے اور اپنی ہڈیوں کیلئے آرام------- یکایک عید آئیگی- لوگ نئے کپڑوں سے محروم رہینگے- خود تمہارے پاس بھی پہننے کو اچھے کپڑے نہیں ہونگے- جب تمہاری سہیلیاں تمھیں باہر لے جانے کو آئینگی"-

"اگر انہوں نے اپنے دلوں میں دھوکہ رکھکر باریک سے باریک سوت بھی کاتا تو سوداگروں نے ان کا رتی بھر سوت بھی نہیں لیا----- اور انہوں نے دل میں محبوب کی محبت کو جگہ دی اور موٹا سوت کاتا تو سوداگر نے ان کا سوت تولے بغیر ہی قبول کرلیا"-

"جن کے دلوں میں ڈر تھا جب انہوں نے سوت کاتا تو ان کے پریتم نے ان کے برے سوت کو بھی پسند کرلیا"۔

اس پورے سر کا یہی انداز ہے۔ زندگی کی سادگی ہے۔ احساس کا خلوص ہے اور شاعرانہ بیان کی تازگی اور ان سب چیزوں پر چھایا ہوا صوفیانہ تخیل۔ شاہ کے کلام کی یہی خصوصیات ہیں جنہوں نے انہیں سندھ کے ہر طبقہ کا محبوب بنایا ہے۔ اسکا پس منظر وہ زندگی ہے جسے انہوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ احساس ہے جس کی دھڑکن انہوں نے دوسروں سے زیادہ خود سنی ہے۔ زندگی کی ان تفصیلات پر ان کی گہری نظر ہے لیکن وہ اپنے شاعرانہ حسن انتخاب کی مدد سے اس پوری فضا میں سے صرف ایسی چیزیں چنتے ہیں جو ان کے مخصوص طرز تخیل اور ایک اخلاقی نصب العین کی وضاحت میں ممد ثابت ہوتی ہیں اور ان دو چیزوں کے درمیان صحیح امتزاج ہے کہ ایک چیز دوسری کے اثر اور مقصد کو زائل اور فنا نہیں کرتی۔ زندگی کی ایک خاص فضا نظر کے سامنے آجاتی ہے اور ذہن اس اخلاقی نکتہ کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے جو اس فضا میں رہکر شاعر نے دوسروں تک پہونچانا چا ہا ہے۔ ------- اس لئے ایک جگہ میں نے کہا تھا کہ شاہ صوفی بھی ہیں اور شاعر بھی۔ اور یہ دونوں خصوصیات ان کی شخصیت کا جزو لاینفک ہیں اور اسلئے ان کے کلام کا کوئی حصہ بھی ایسا نہیں جس میں ان کی اس ملی جلی شخصیت کا پرتو نہ ہو۔ چنانچہ ان کے کلام کا وہ جزو بھی جس میں سندھ کی مروجہ لوک کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ شروع سے آخر تک تصوف اور شاعری کا ایک بے حد متوازن اور شیریں امتزاج ہے۔

رسالہ میں اس طرح کی پانچ کہانیاں ہیں۔ "سسی پنوں" "سوہنی مہار" "لیلی چنیسر" "مومل رانو" اور "ماروی عمر"۔ لیکن ایک مزے کی بات یہ ہے کہ شاہ نے یہ کہانیاں پوری کی پوری بیان کرنے کے بجائے ان کے وہ ٹکڑے سامنے رکھے ہیں۔ جہاں کہانی اپنے نکتہ عروج پر پہنچتی ہے۔ کہانی کا یہ نکتہ عروج عشق کی آزمائش کا سخت ترین لمحہ ہوتا ہے۔ چنانچہ شاہ کو اس نفسیاتی لمحہ میں جو شاعرانہ اور صوفیانہ امکانات نظر آئے ان سے انہوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اور کہانی کے اس نکتہ پر پہنچ کر عاشق کی ذہنی کیفیت کی ترجمانی کرنے کے علاوہ اسے اس آفاقی عشق کی راہ دکھائی ہے جس پر چل کر ارضی محبت بھی سماوی مراتب حاصل کرلیتی ہے۔ ان کہانیوں میں سونی مہار ایسی ہے جو ان کے صوفیانہ مطمع نظر کی سب سے زیادہ صحیح ترجمانی کرتی ہے۔ اس نظم کے کچھ ٹکڑے پڑھکر اسکا اندازہ کیجئے۔

"دریا میں طوفان اٹھ رہے ہیں۔ بھیانک گھڑیال۔ ہزاروں بھیانک گھڑیال منہ پھاڑے کھڑے ہیں۔ اے ساحر۔ میرا نازک جسم بغیر تیرے سہارے کے اس خطرہ کا مقابلہ نہیں کرسکتا---- آ۔ ندی میں آ جا۔ اے او۔ جو میرا آقا اور مجھ پر مہربانیاں کرنے والا ہے"

"جب کچا گھڑا ٹوٹ گیا اور ندی کا سہارا باقی نہ رہا تو سوہنی کے کانوں میں اس محبوب چرواہے کی آواز گونجی---- "اے سوہنی سلامتی کے طریقوں کو

بھول جا" محبت تیری نگہبان ہے۔ وہ تجھے ان بپھری ہوئی موجوں کے پار لے جائیگی۔ محبت جن کی رہبر ہے وہ تیزی سے گہرے پانی میں سے گزر جاتے ہیں۔ اس گہرائی میں محبت کا سہارا پکڑ۔ چرواہا ان کی خبر گیری کرتا ہے جو اسے تلاش کرتے ہیں"۔

"میں محبت کے خیال کو روکنے کیلئے لاکھ جتن کرتی ہوں لیکن وہ نہیں رکتا اسلئے میں اب اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر پانی میں کود جاونگی۔ جن کے خیال چرواہے کے ساتھ ہیں انہیں ایسا کرنیکا حق ہے"۔

سوہنی۔ "لوگ دریا کے دوسری طرف کھڑے ہیں اور مجھے بلا رہے ہیں کہ سوہنی۔ آ۔ لیکن دو خطرے ایسے ہیں جو میرے دل کو روکتے ہیں۔ تیز بہتا ہوا گہرا دریا اور یہ کچا گھڑا۔ لیکن جن کے ساتھ سچائی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ کبھی نہیں ڈوبتے"۔

سید۔ "تو پھر اللہ کی مدد سے بھروسہ کو اپنی کشتی بنا۔ جو عورتیں۔ ساحر۔ کے کہے پر چلتی ہیں وہ کبھی خطرے میں نہیں ------- دیکھو سمجھدار آدمی جب ڈوبنے لگتا ہے تو جھاڑیوں کو پکڑ لیتا ہے لیکن ذرا دیکھو کہ کبھی تو یہی جھاڑیاں سہارے لینے والے کو کنارے تک پہونچادیتی ہیں اور کبھی وہ ٹوٹ جاتی ہیں اور پکڑنے والا دریا میں ڈوب جاتا ہے"۔

سوہنی مہار میں اور اسی طرح دوسری کہانیوں میں جا بجا شاہ نے عشق کو بزرگی و برتری کے یہ آداب سکھائے ہیں۔ عشق میں سوائے ایک سہارے کے اور سب بیکار ہیں لیکن یہ آداب سکھاتے وقت ان کا لہجہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ پڑھنے والا اپنی روزانہ کی زندگی کی فضا اور اس کے بے تکلف ماحول سے دوری محسوس کرے۔ تصوف اور شاعری دونوں کا پس منظر خالص ارضی اور چھوٹی سے چھوٹی تفصیل میں بھی مقامی ہے۔ یہاں تاثیر تخیل کی بلند پروازیوں کا سہارا ڈھونڈنے کے بجائے جذبات کی صداقت اور زندگی کی سادگی پر تکیہ کرتی ہے اور یہی چیز ہے جس نے ہر دل میں اس کیلئے گھر بنایا ہے۔

یہ ہے شاہ عبداللطیف کے کلام کا ایک سرسری سا تعارف۔ افسوس ہے کہ اس تعارف میں شاہ کے حسن بیان اور ان کے شاعرانہ فن کا کوئی ذکر نہیں آیا۔

(ماہ نو کے شکریہ کے ساتھ)

شاہ ہمیشہ زندہ رہیں گے

رشید اختر ندوی

یہ گو ایک عجیب سی بات ہے۔ مگر امر واقعہ ہے۔ کہ سندھ کے لوگ اپنے ہاں کے اسکندروں اور داراوں کو بھول گئے۔ سندھ کی ہر بڑی سیاسی شخصیت اپنے ہر جبر و قہر اور اپنی ہر بڑائی و بزرگی کے باوجود سندھیوں کے ذہنوں سے نکل گئی۔ مگر وہ اب تک شاہ عبداللطیف کو نہیں بھول سکے۔

یہ شاہ کی عظمت و بڑائی کا ایک غیر فانی ثبوت ہے۔ اور تاریخ خوب جانتی ہے کہ شاہ نے جو ہر دلعزیزی اپنی زندگی میں پائی وہی اسے اس کی موت کے بعد بھی حاصل رہی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شاہ کی بڑائی میں اس کی خاندانی بزرگی بھی ایک بڑا عنصر تھی۔ وہ اگر سید خاندان سے نہ ہوتے تو ہوسکتا تھا کہ سندھ کے عوام خصوصیت سے ان پڑھ لوگ انہیں وہ تقدس نہ دیتے جو انہیں سید ہونے کے سبب ملا۔

شاہ سے سندھ کے لوگوں نے بڑی کرامات وابستہ کی ہیں۔ سندھ کی زبانی روایات میں جو مرزا قلیچ بیگ کے کانوں تک پورے تواتر کے ساتھ پہنچی تھیں اور جو اب بھی سندھ کے دیہی خاندانوں میں سنی سنائی جاتی ہیں۔ شاہ کو وہی تقدس بخشا گیا ہے جو بڑے اولیاء کے لئے مسلمانوں نے مخصوص کرلیا ہے۔ اس کے باوجود یہ صرف شاہ تھے جنہوں نے بلا لحاظ عقیدہ و قوم سندھ کے ہر گروہ میں یکساں محبوبیت پائی۔ شاہ کے سوا کوئی دوسری شخصیت سندھ کی تاریخ میں ایسی نہیں ہے جسے یہ قبول عام نصیب ہوا ہو۔

شاہ کی عظمت کے باوجود تاریخ تا روایات یہ تعین نہیں کر سکی کہ شاہ کس دن کس تاریخ یا کس مہینہ میں پیدا ہوئے۔ اور کس دن اس دنیا سے دوسری دنیا کو تشریف لے گئے۔ شاہ کے حالات کی تحقیق کرنے والے مورخین نے صرف قیاس کیا ہے کہ شاہ سنہ ۱۶۸۹ میں پیدا ہوچکے تھے اور سنہ ۱۷۵۲ میں اس دنیا میں موجود نہ تھے۔ تاریخ ولادت و موت

کو چھوڑ کر یوں شاہ کے دور کی تخصیص واضح ہے۔ اورنگ زیب کا جب انتقال ہوا تو وہ اٹھارہ سال کے جوان تھے۔ نادر شاہ کے حملے کے وقت ان کی عمر پچاس سال کی تھی اور جب احمد شاہ ابدالی نے سندھ کو اپنی سلطنت کا ایک جزو بنایا تو وہ ۵۸ سال کے تھے اور پھر وہ جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ان کی عمر ۶۳ برس کی تھی۔

ان وضاحتوں کے بعد یہ جاننا کچھ زیادہ ضروری نہیں رہ جاتا کہ شاہ کس دن پیدا ہوئے یا کس دن مرے۔ وہ کسی ایک گروہ یا ایک طبقہ سے مخصوص نہ تھے۔ وہ سب تھے۔ ان کی زندگی ہر قسم کے تعصب۔ مخصوص لگاو یا رجحان سے بالا تھی۔ انہوں نے اپنے وقت کی سیاسیات سے کبھی کوئی دلچسپی نہ لی۔

انہوں نے جس خاندان کی گود میں آنکھ کھولی اسے دنیا کی ہر لذت میسر تھی۔ دولت تھی۔ عزت تھی۔ آرام تھا۔ آسائش تھی۔ مگر شاہ کو یہ ساری چیزیں بچپن میں تو شائد بھلی معلوم ہوئی ہوں۔ جوانی میں قطعاً نہ بھائیں۔ وہ ہر قسم کے تعیش۔ ہر قسم کے تکبر۔ بے اعتدالی اور حب جاہ و مال سے پاک رہے۔ ان کی ساری زندگی ایک خدا ترس درویش۔ ایک فرض شناس مسلمان۔ ایک ہمدرد اور حساس انسان کی تھی۔ انہوں نے نہ کبھی کسی کو مارا۔ نہ کبھی کسی کو ڈانٹا۔ وہ جانوروں تک پر رحم کھاتے۔ ان کی جوانی ہر بے اعتدالی سے پاک تھی۔ ان کی بیوی کے سوا ان کی سکونت گاہوں کی کوئی اور جوان عورت یہ دعویٰ نہ کرسکی کہ ان کا دامن کبھی اس تک پھیلا۔

وہ اپنی جوانی میں بڑے خوبصورت۔ تنومند۔ خوش قامت و خوش گلو تھے۔ ان کی آنکھیں سیاہ اور نشیلی تھیں۔ بھٹ میں جہاں وہ دفن ہوئے۔ ان کی چند یادگاریں اب تک محفوظ ہیں۔ ان کا وہ پیالہ بھی اب تک دیکھا جاسکتا ہے جس میں وہ کھایا کرتے۔ ناریل کا یہ پیالہ۔ یا کاسہ گدائی ان کی سادہ زندگی اور درویشانہ عادتوں کی شہادت دیتا ہے۔ ان کا بچپن کچھ بھٹ میں اور کچھ کوٹڑی میں گزرا۔ جہاں ان کے والد شاہ حبیب نے سکونت اختیار کرلی تھی۔ لیکن ان کی ساری جوانی فقیروں اور خدا رسیدہ سیدوں کی رکاب میں کٹی۔ وہ جس بڑے درویش یا فقیر کا نام سنتے اس کی طرف لپکتے۔ اور اپنے فقر کے توشہ میں اضافہ کرتے۔ ان کے باپ کا خیال تھا کہ وہ ان کی جگہ لیں گے اور ان کی طرح بھٹ یا کوٹڑی میں سکونت اختیار کریں گے۔ مگر شاہ ہر بڑے اور غیر معمولی آدمی کی طرح سیمابیت کے پیکر تھے۔ وہ ایک جگہ نہیں ٹھیرے۔ ایک مرشد پر قناعت نہ کی۔ وہ سینکڑوں بزرگوں کے حضور میں حاضر ہوئے اور ہر ایک کے زہد و علم سے حصہ پایا۔

یہ ایک بڑا وصف ہے۔ یہ بڑی خوبی ہے۔ خصوصیت سے صوفی اور درویش کے لئے تو یہ ایک لازمہ حیات کی حیثیت رکھتی ہے۔ شاہ میں یہ وصف مکمل طور پر موجود تھا۔ وہ سندھ کی وادی میں جگہ جگہ ٹھیرے۔ صحراوں سے گزرے۔ پہاڑیوں تک رسائی پائی۔ وہ اپنے وقت کے سارے بڑے درویشوں سے مل چکے تھے۔ اور ہر ایک سے کسب فیض کیا تھا۔
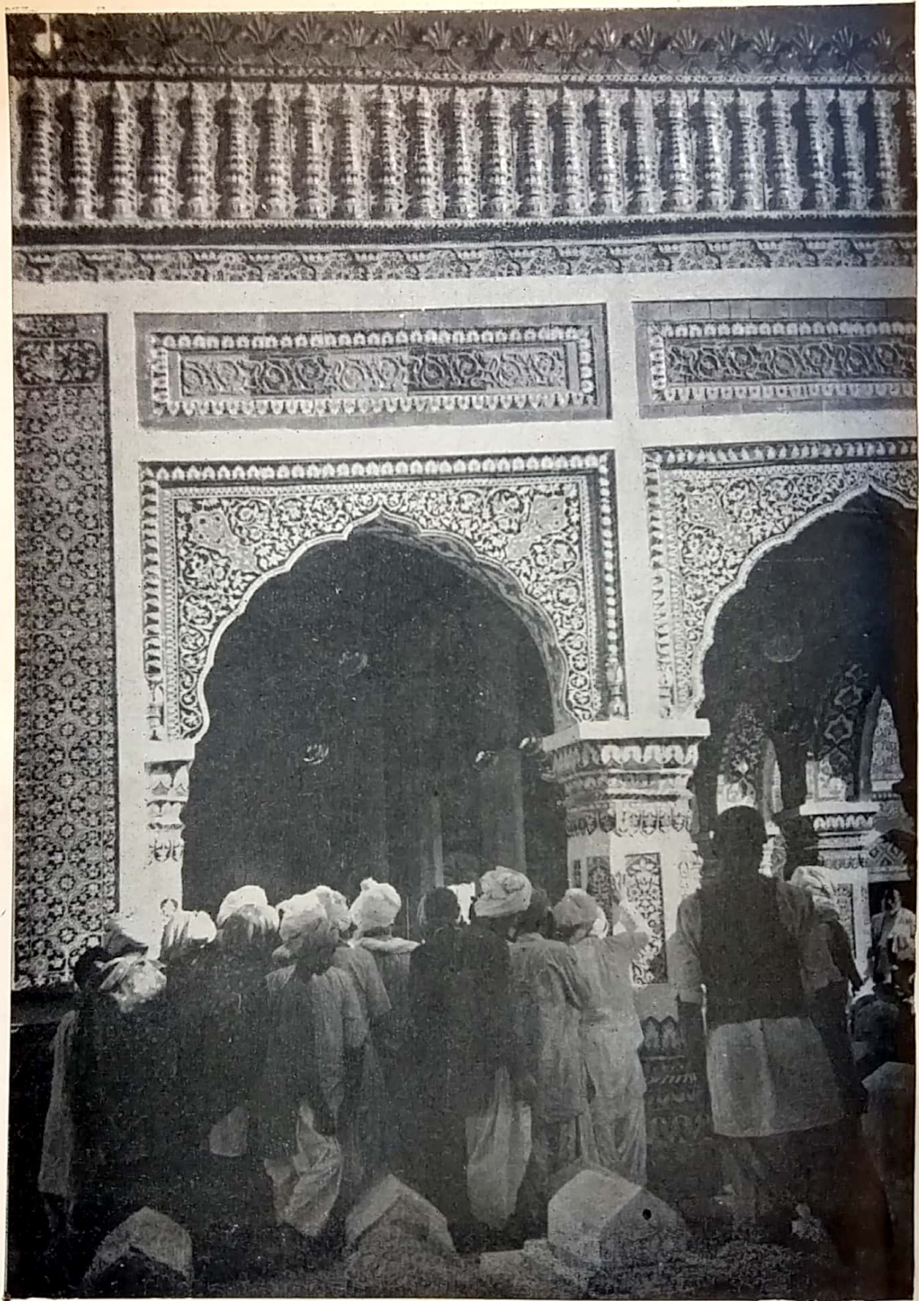
محفل سماع کا ایک منظر

یہی چیز ان کی شاعری کی ہمہ گیری و گہرائی کی بنیاد بنی اور ان کی نظر نے غیر معمولی وسعت و دوربینی پالی۔

شاہ کی درویشانہ اور بے ضرر زندگی بھی رشک و حسد سے بچ نہ سکی۔ اور اسی قسم کے مرنجا مرنج آدمی پر بھی ان کے بعض رشتہ داروں نے رقیبانہ حملے کئے۔ شاہ کے سادہ نظریات سب کے سامنے تھے۔ وہ کسی ایک گروہ یا فرقہ سے خصوصیت نہ رکھتے تھے اور نہ ان کے اندر وہ خاندانی تعصب و مخصوص رعونت تھی جو اس وقت کے سادات میں عام تھی اسی وجہ سے انہوں نے اپنے ایک دوست میرزا مغل بیگ کی شہادت پر اس کی بیٹی سے نکاح کرلیا۔ اور اپنے خاندان کی نفرت و دشمنی کا نشانہ بنے۔

یہ وہ دور تھا جب نور محمد کلہوڑا سیاسی اقتدار حاصل کر رہا تھا۔ سیدوں نے اس کی مدد کی تھی۔ اس لئے انہوں نے شاہ کے خلاف نور محمد کو خوب ورغلایا۔ اور ان کی راہ میں کانٹے ہی کانٹے بچھ گئے۔

مگر شاہ کی خداداد صلاحیتیں ان کے کام آئیں۔ اور ان کے گیتوں کی مٹھاس و شیرینی اور ان کی نیکی اور شریفانہ زندگی نے عوام کو ان کا گرویدہ بنادیا۔ ان کی ہردلعزیزی رفتہ رفتہ بڑھتی رہی۔ ان کی خدا ترسی اور پاکیزہ صفات نے عقیدت مندوں کا ایک بڑا گروہ ان کے گرد جمع کردیا۔ انہوں نے اپنے خاندان سے علحیدگی اختیار کرلی اور ریت کے ایک ٹیلے پر اپنے لئے اور اپنے ساتھیوں کے لئے جھونپڑے بنائے۔ یوں بہت پر فضا ماحول میں گھرا تھا۔ اس کے ایک طرف کرار جھیل تھی۔ اور دوسری سمتوں میں قدرتی جوہر اور سبزہ زار تھے۔

بہ ہر حال اسے شاہ لطیف کا باطنی تصرف سمجھئیے یا قدرتی امر کہ شاہ کی نئی اقامت گاہ اس حسن سے مالا مال تھی۔ تھوڑے ہی دنوں میں شاہ نے وہاں ایک اچھی خاصی بستی بسالی اور عقیدت مندوں کے گروہ کے گروہ وہاں آن بسے۔ آخر میں شاہ کے والد بھی وہیں آگئے اور اسی مٹی میں آخری قیام پسند فرمایا۔

شاہ کے صوفیانہ اشعار اب سندھ کے طول و عرض میں گائے جانے لگے تھے۔ انہیں فقیر بھی گاتے اور امیر بھی۔ انہیں غریب بھی پسند کرتے اور شاہی محلوں کے مکین بھی ان پر سر دھنتے۔ کوئی دن خالی نہ گزرتا جب شاہ کے کلام کے مشتاق ہزاروں کی تعداد میں ان کے بھٹ کے گرد نہ جمع ہوتے۔ خصوصیت سے ان کے آخری زمانہ میں تو ان کے عقیدت مند بہت بڑھ گئے تھے۔ شاہ کی آواز میں بڑی مٹھاس اور ایک عجیب جادو تھا۔ وہ جب اپنے اشعار پڑھ رہے ہوتے تو مجمع پر عجیب عالم ہوتا۔ ہوا رکی رکی محسوس ہوتی۔ تنفس تیز ہوجاتے اور دل دھک دھک کرنے لگتے۔

ان کے بعض عقیدت مندوں سے یہ روایت سینہ بہ سینہ موجودہ دور تک پہنچی ہے کہ شاہ کو الہام ہوتا۔ اور ان کے لحن داودی میں خدا کی براہ راست رہنمائی شامل تھی۔ یہ بحث ہمارے بس کی نہیں کہ شاہ کے وجدان کا کیا عالم تھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ شاہ کی

عام تعلیم کچھ زیادہ نہ تھی۔ گو قران حکیم۔ مثنوی مولانا روم اور شاہ کریم کے منقولات ہر لمحہ ان کے ساتھ ہوتے مگر ان کا کتابی علم کہاں تک وسیع تھا۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا البتہ ان کی شاعری شاہد ہے کہ ان کی نظر غیر معمولی وسیع اور ان کا وجدان بہت اونچا تھا۔ وہ انسانی نفسیات سے بھی خوب آگاہ تھے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ الہام جو لوگوں نے ان سے وابستہ کیا اس صحبت صالح کا اثر ہو جو وقت کے فقرا اور درویشوں کے ساتھ شاہ کو نصیب ہوئی۔

وہ اپنے اشعار خود نہ لکھتے۔ ان کے مریدوں نے مختلف اوقات میں ان کا کلام لکھا اور یہ کلام بعد میں جمع ہوا۔ انہیں اپنا سارا کلام حفظ تھا۔ ان کے مرید بھی ان کے کلام کے حافظ تھے۔ خصوصیت سے ہاشم۔ بلال اور تمر کو تو شاہ کا ایک ایک شعر یاد تھا۔

شاہ کی موت کے بعد ہزاروں لوگ ایسے پائے گئے جو شاہ کے اشعار کو صبح و شام گاتے تو بھی ان کا ذخیرہ حفظ ختم نہ ہوتا۔

کچھ عجیب بات ہے کہ شاہ کے کلام کا مجموعہ جس نے بعد میں رسالو کا عنوان پایا۔ اس طرح مرتب ہوا جس طرح قران حکیم کی ترتیب عمل میں آئی۔ قران سے یہ تشابہ کسی غلط عقیدت کا مظہر نہیں ہے جیسا کہ مسٹر سورلے کا خیال ہے۔ یہ تشابہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ سندہ کے ریگ زار میں تعلیم کی ویسی ہی کمی تھی جیسی عرب میں۔

دیا رام گدو مل کا بیان ہے۔ کہ شاہ کی زندگی میں ان کے دو شاگردوں تمر اور ہاشم ان کے کلام کا مرتب مجموعہ ان کے پاس لائے۔ شاہ نے اسے دیکھا اور پھر کرار جھیل میں پھینک دیا۔ شاہ کو یہ مجموعہ پسند نہیں آیا۔ اور انہوں نے انہیں اس کی دوبارہ ترتیب کا حکم دیا۔ اس روایت سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ ہاشم اور تمر شاہ کے پورے کلام کے حافظ تھے۔ اور شاہ نے نئی ترتیب میں انہیں محض حافظہ پر بھروسہ کرنے کی ہدایت کی تھی۔

شاہ کو اس وقت کے ماحول میں جو عظمت نصیب ہوئی اس کا اندازہ صرف اس بات سے کیا جاسکے گا کہ نور محمد کلہوڑہ۔ جو سندہ کی سب سے بڑی سیاسی شخصیت تھی اور جسے بعض سادات نے شاہ سے بد دل کردیا تھا۔ بڑی عقیدت کے ساتھ شاہ کے حضور حاضر ہوا اور شاہ سے اپنے لئے دعا چاہی۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کا جانشین غلام حسین کلہوڑا بھی شاہ کی دعا کا نتیجہ تھا۔ غلام حسین کو شاہ سے جو عقیدت و ارادت تھی اس کا پتہ اس عمارت سے چلتا ہے جو کلہوڑا نے ان کے مزار پر تعمیر کی۔

گدو مل کہتا ہے کہ جب اس نے سنہ ۱۸۸۲ میں اس مزار کی زیارت کی تو وہاں دو سو سے زیادہ مجاور پائے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور یہ سب کے سب بڑے مخلص شریف اور نیکو کار تھے۔ ان کو دیکھ کر گدو مل کو شاہ کی عظمت کا اور زیادہ احساس ہوا

شاہ اپنی شخصیت کی طرح اپنی شاعری میں بڑی ندرت کے مالک تھے۔ وہ ان عظیم بین الاقوامی قدر رکھنے والے فنکاروں میں سے ہیں۔ جنہوں نے انسانی فلاح و بہبود اور تعلیم و اصلاح کا کام اپنے شعر کے ذریعہ کیا۔ وہ بہ یک وقت رومی۔ سعدی اور حافظ تھے۔ گو ان کا کتابی علم رومی۔ سعدی اور حافظ کا ہم پلہ نہ تھا۔ گو ان کی زبان جسے انہوں نے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ دنیا کی بڑی زبانوں میں سے نہ تھی۔ مگر انہوں نے جو پیغام اس زبان کے ذریعہ دیا۔ وہ رومی و سعدی اور حافظ کے پیغام سے کسی طرح کم نہیں۔ اپنے پیغام کی عظمت کی وجہ سے وہ ان معلمین عالم میں شمار ہوتے ہیں جو اس دنیا میں کبھی کبھی آتے ہیں اور جن کا شعر غیر فانی حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔

مسٹر سورلے کے الفاظ میں۔ شاہ قرون وسطی کے بڑے شعراء میں سے آخری بڑے شاعر تھے۔ خصوصیت سے سندہ میں تنہا وہی ایسے بڑے شاعر ہیں جن کی عظمت غیر فانی کہی جاسکتی ہے۔

ہم یہ کہتے وقت سندہی زبان کے شعراء سے معافی چاہیں گے کہ سندہی زبان شاہ جیسا بڑا شاعر نہ شاہ سے پہلے پیدا کرسکی اور نہ شاہ کے بعد اسے کوئی ایسا شاعر نصیب ہوا اور بہت ممکن ہے۔ ایسا شاعر پھر کبھی پیدا نہ ہو۔ خصوصیت سے شاہ کا وجدان اور ان کی نظر تو پھر کبھی کسی سندہی شاعر کے حصہ میں نہیں آئی۔ شائد اس لئے شاہ کے مریدوں نے انہیں ملہم من اللہ۔ پیغامبروں میں شمار کیا اور اسی وجہ سے ان کا مزار نظام الدین اولیاء اور خواجہ فرید بخش کی طرح مرجع خاص و عام بنا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شاہ لطیف جس زمانہ میں اس دنیا میں آئے۔ اس وقت کا ماحول خیالات و احساسات آج کی دنیا کے احساسات و جذبات سے مختلف تھے۔ لیکن شاہ لطیف کی یہ کتنی بڑی عظمت ہے کہ سندہ آج بھی ان کے کلام میں وہی حظ و تاثر پاتا ہے جو کبھی وہ لوگ محسوس کرتے جو شاہ کے زمانہ میں جی رہے تھے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ موجودہ دنیا کا شعر پہلے دور کے شعر اور اس کی خصوصیت سے بہت بدل گیا ہے۔ پہلے کی سادگی کی جگہ پختہ کاری۔ پہلے کی جذباتیت کی جگہ "عملیت" نے لے لی ہے۔ بالکل اس طرح جس طرح آج کا انسان۔ اس انسان سے بہت بدلا ہوا ہے جو قرون اولی کے دنوں میں اس دنیا میں رہتا تھا۔ خصوصیت سے سندہ کا وہ زمانہ جب شاہ زندہ تھے۔ آج کے زمانہ سے بہت مختلف تھا۔ اس کے باوجود ہمارا دعویٰ ہے کہ شاہ نے اس وقت جو قبول عام پایا۔ وہ انہیں آج بھی نصیب ہے۔ اور یہ ان کی غیر معمولی بڑائی کی ضمانت ہے۔

شاہ کی بڑائی کا تصور کچھ اور عجیب ہوجاتا ہے جب ہماری نگاہ اس لسانی ماحول کو دیکھتی ہے۔ جب شاہ نے شاعری کی۔ اس وقت عربی اور فارسی کے سوا دوسری کوئی زبان۔ علماء۔ فضلاء اور حکماء کی زبان نہ تھی۔ ہر قسم کے حکیمانہ خیالات و تصورات کے اظہار کے لئے یہی دونوں زبانیں ذریعہ بنائی جاتیں۔ سندہی کی حیثیت لسانی لحاظ سے اس درجہ پست تھی کہ یہ تصور بھی نہ کیا جاسکتا تھا کہ کوئی بڑا حکیم و فلسفی اسے اپنائیے گا۔

حقیقت دیکھئے تو شاہ نے اس زبان کو اپنے تصورات کے اظہار کا ذریعہ بناکر اپنی بڑائی کا ایک اور بڑا ثبوت دیا۔ اور غالباً یہی وجہ تھی کہ سندہ کے لوگ انہیں اپنی بولی میں اتنی اونچی باتیں کہتے پاکر اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے کہ شاہ پر وحی نازل ہوتی ہے۔

آج کی سندہی زبان زیادہ مہذب و مرتب زبان کہی جاسکتی ہے۔ آج کے سندہی شاعر خود کو۔ موجودہ دور اور اس کے رجحانات کا ترجمان کہہ سکتے ہیں لیکن اگر وہ چاہیں کہ شاہ لطیف کے تصورات و احساسات کو اپناکر کوئی غیرفانی تاثر قائم کرسکیں تو یہ ناممکن ہوگا۔ شاہ کا سندہ اور اس کے احساسات آج کے احساسات نہ تھے۔ اس لئے آج کی مہذب شاعری اور اس کے ذرائع ان احساسات کو اپنے اندر سمونے سے قطعاً قاصر رہیں گے جن کے اظہار کے سبب شاہ نے غیر فانی عظمت پائی۔ شاہ نے جو دور پایا اس میں مسلمان قوم ابھی زندہ و حکمران قوم تھی۔ سندہی عوام خود کو اس بڑی قوم کے افراد سمجھتے تھے جس نے ہندوستان میں صدیوں حکومت کی تھی۔ شاہ خود اس عظمت سے بے حد متاثر تھے۔ ساتھ ہی ساتھ شاہ کو ان کمزوریوں اور بیماریوں کا بھی پورا احساس تھا جو ان کی قوم کے قوی جسم کو لگ چکی تھیں۔ گو ان کی مخاطب ہندوستان میں بسنے والی پوری قوم نہ تھی۔ صرف سندہی زبان بولنے والا ایک خاص گروہ تھا۔ تاہم انہوں نے ان سے وہی باتیں کہیں جو رومی اور سعدی نے فارسی جیسی بین‌الاقوامی زبان میں پوری ملت مسلمہ سے کہی تھیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ جلال‌الدین رومی کے ذریعہ اظہار کے سبب وہ زیادہ وسیع حلقہ میں سمجھے اور پڑھے گئے۔ اور اس لئے ان کی شخصیت زیادہ متعارف ہوئی۔ مگر یوں مغز و حکمت کے لحاظ سے شاہ اور رومی دونوں ہم پلہ ہیں۔ شاہ کے حصہ میں بھی وہی حکمت آئی تھی جس نے رومی کے ذہن و دل کو منور کیا تھا۔

امام مالک کے الفاظ میں۔ یہ حکمت جن بزرگوں کو عطا کی جاتی ہے وہ بڑے ہی خوش نصیب ہوتے ہیں۔

رومی اس ملت کے بڑے حکیم تھے۔ وہی درجہ جامی و حافظ کو نصیب ہوا اور ہندی مسلمانوں میں شاہ لطیف اور شاہ ولی اللہ کو یہ سرمایہ پہنچا۔

دیکھنے والوں نے شاہ لطیف کے ہاتھ میں مثنوی مولانا روم کو اکثر دیکھی لیکن شاہ نے کبھی مولانا رومی کی تقلید نہیں کی۔ کبھی مولانا رومی کے انداز میں شعر نہیں کہا۔ ان کا اپنا مخصوص انداز بیان تھا۔ وہ اپنی طرز کے آپ موجد۔ آپ خالق اور آپ مبداء آغاز تھے۔ انہوں نے سندہی عوام کے امراض ذہنی و جسمانی و اجتماعی کا آپ اپنی دانائی و حکمت سے تجزیہ کیا۔ انہوں نے آپ منطقی نتائج مرتب کئے اور پھر اس کے حل۔ قران حکیم اور بزرگ اسلاف کے اقوال کی روشنی میں تجویز فرمائے۔

وہ اپنے دور کے بعض دوسرے ہندی شعراء کی طرح جنہوں نے فارسی کو رومی و حافظ و سعدی کی پیروی میں ذریعہ اظہار خیال بنایا۔ وہ کسی کے نقال نہیں تھے۔ انکے احساسات و جذبات اور منطقی نتائج ان کے اس فہم و ادراک کی پیداوار تھے جو قدرت کی طرف سے انہیں ودیعت کیا گیا تھا۔ ان کی شاعری اس حکمت الٰہیہ کی براہ راست تابع تھی جو انبیاء اور اولیائے کرام کو براہ راست عطا کی جاتی رہی ہے۔

وہ یقیناً نبی نہ تھے- وہ نہ بہت پڑھے لکھے اور فلسفی تھے- لیکن ان کا ذہن اور نظر دونوں ایک خاص حکمت کے آئینہ وار تھے- اور یہی وہ حکمت تھی جس نے ان کے شعر میں خلوص- سوز- اثر اور غیر معمولی روانی پیدا کی اور یہی وہ حکمت تھی جس نے ان کے کلام کو قبول عام عطا کیا-

ہمارے نزدیک شاہ لطیف کا یہ ایک بڑا اعجاز تھا کہ انہوں نے اس وقت کی زبانوں میں بالکل ایک پس ماندہ اور غیر ترقی یافتہ زبان میں اپنی قوم سے خطاب کیا- اور اپنے اس خطاب میں وہ داود سے کسی طرح پیچھے نہ رہے- شاہ لطیف کی عظمت اور بزرگی کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے ماحول میں رہنے والے بڑے علماء اور مجتہدین کی بھی پیروی نہ کی- انہوں نے اپنے علم کے اظہار کے لئے فارسی اور عربی کو ذریعہ نہیں بنایا- انہوں نے خواص سے گفتگو کرنے کا تکلف بھی پسند نہیں کیا- اور ان کے رویہ کے بالکل بر عکس وہ زبان استعمال کی جو محض عوام کی زبان تھی- جسے خواص کے حریم ناز و علم میں رسائی نہ تھی-

اور ایک غیر معمولی بڑے آدمی کا امتحان اسی وقت ہوتا ہے جب وہ مردہ جسموں میں جان ڈالتا ہے- سندہی زبان بھی اس وقت مردہ تھی شاہ نے اس میں جان ڈالی- اور ان تمام عظیم تصورات و تخیلات کو اس کی جھولی میں ڈال دیا جو بڑی قوموں نے محض اپنی زبانوں کے لئے مخصوص کر رکھے تھے- اور جن کے وارث و اہل وہ محض اپنی زبانوں کو سمجھتے تھے- ہادی اسلام کے سبب عربی اوپر اٹھی- فارسی بولنے والے حکمرانوں نے فارسی کو تخت پر بٹھایا- سندہی کو ایسی کوئی بڑی شخصیت نہ ملی تھی جو سندہی کو اوپر اٹھاتی- شاہ لطیف نہ نبی تھے- نہ حکمران- وہ ایک درویش تھے- وہ ایک قلندر تھے- قدرت نے انہیں شعر کہنے کا سلیقہ عطا کیا تھا- انہوں نے عربی اور فارسی کے ہر احترام کے باوجود اپنی بولی کو اپنے فن کے اظہار کے لئے استعمال کیا- اور جاننے والے جانتے ہیں کہ شاہ کے اونچے تصورات اور حکیمانہ تخیلات نے اس بولی کو پر لگادئے- - اور وہ اس اونچی مسند پر جا پہنچی جہاں دوسری زبانیں تھیں-

اس میں کلام نہیں کہ نہ شاہ سے پہلے اور نہ شاہ کے بعد کوئی بڑا حکیم- کوئی بڑا مسیحا اس زبان کو ملا- اگر ایسا ہوتا تو یہ زبان یقیناً اپنی منزلت کو قائم رکھ سکتی-

زبانوں میں سندہی کا درجہ کیا ہے- یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے- ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ شاہ نے جب اس زبان کو ذریعہ اظہار خیال بنایا- تو یہ بالکل تہی دامن تھی- شاہ نے اس کے دامن میں ہزار ہزار وسعتیں بھی پیدا کیں اور پھر اس میں حکمت کے موتی و جواہر بھی جڑے-

اس میں کوئی کلام نہیں کہ شاہ نے اپنی شاعری کا زیادہ تر مواد سندہ ہی کی قومی روایات و حکایات سے لیا- انہوں نے اپنے اشعار کے لئے وہی دھنیں اختیار کیں جو سندہ میں اس وقت رائج تھیں- انہوں نے کوئی نئی دھن یا راگ یا راگنی ایجاد نہیں کی- لیکن انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کی مدد سے جو روح ان حکایات ماضی و حال میں بھری وہ ان سے پہلے کوئی اور نہ بھر سکا-

سندھ میں شاہ کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز یہی تھا کہ انہوں نے عوام کے احساسات و جذبات کی صحیح ترجمانی کی- اور ان کے اشعار سن کر- ہر سندھی خواہ وہ عوام میں سے تھا یا خواص میں سے- یہ سمجھا کہ شاہ نے اپنا گیت نہیں گایا- اس کے دل کا ساز چھیڑ دیا ہے-

شاہ چونکہ بہت بڑے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑے موسیقار بھی تھے اس لئے ان کے گیت دھنوں کی صورت میں ان کے ذہن سے ان کی زبان پر آئے اور وقت کے گویوں نے جب یہ دھنیں گائیں- تو عوام وجد میں آگئے-

شاہ گو بڑے مسلمان صوفی شاعر تھے- اور ان کی شاعری اسلامی تصورات و تخیلات کی آئینہ وار ہے- اس کے باوجود سندھ کے غیر مسلم گویے بھی شاہ کو اپنا ترجمان سمجھے- اور انہوں نے ہر جگہ اور ہر محفل میں شاہ کے گیت گائے- اور نہ صرف یہ کہ ان کے زمانہ کے ہندو گویوں نے انہیں اپنایا- تقسیم ہندوستان کے وقت تک کے ہندو گویے اور ہندو عوام شاہ کو اپنا قومی شاعر سمجھتے رہے-

سندھ کا چشم و چراغ

رفیق خاور
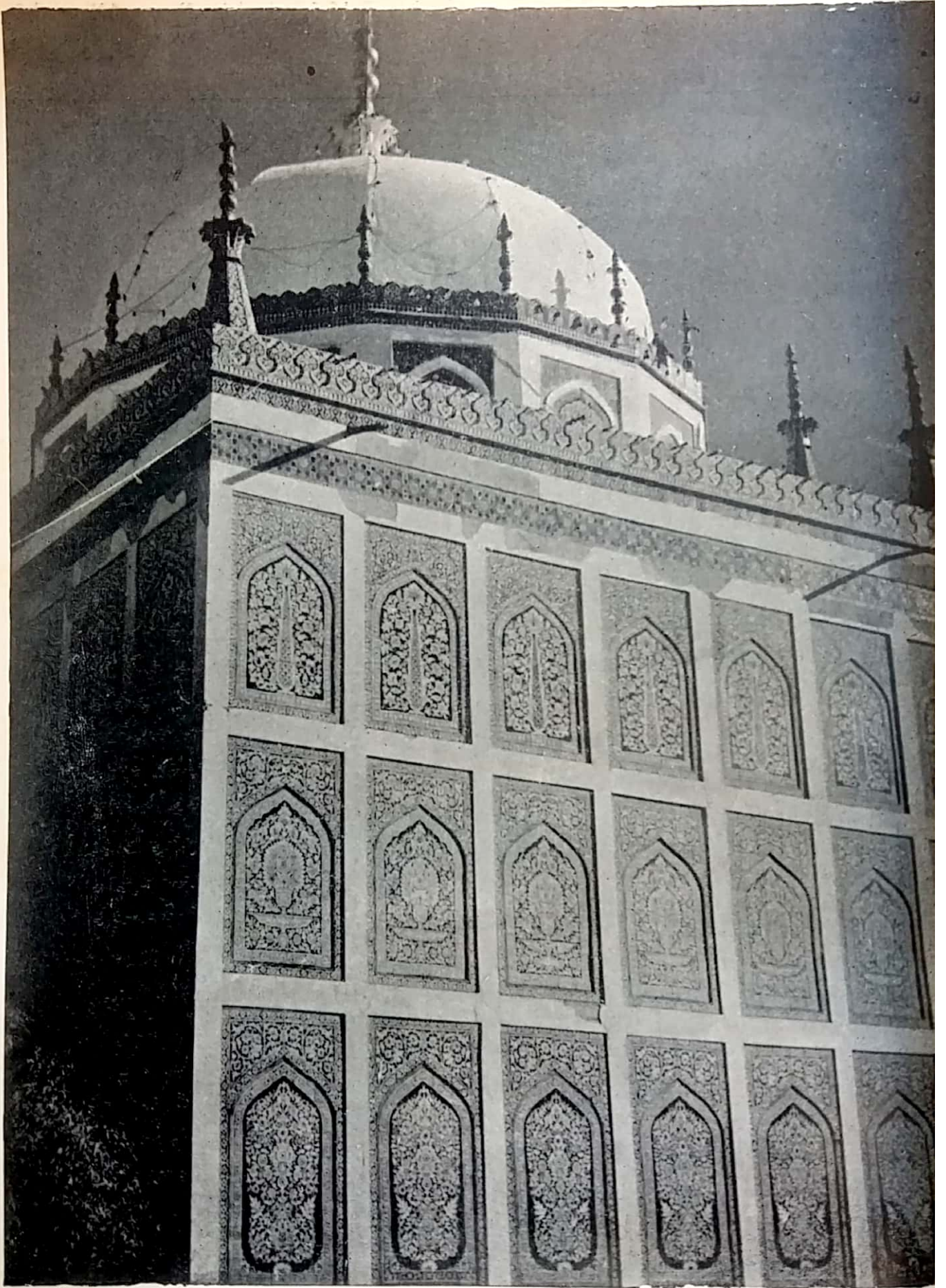
شاہ کے مزار کا پچھلا حصہ

شاہ عبداللطیف بھٹائی سے دو چار ہوتے ہی ہم کچھ ایسا محسوس کرتے ہیں گویا دفعتاً ایک نیا ستارہ طلوع ہوا ہو اور ہم سب کی نظریں اسکو دیکھنے میں محو ہوگئی ہوں- اس میں شبہ نہیں کہ یہ ستارہ افق پر پہلے بھی جلوہ افروز تھا- لیکن اس وسیع ماحول میں جو قیام پاکستان کے ساتھ پیدا ہوا ہے- یہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہوا ہے- اور ہمیں اپنی مسحور کن تابانیوں سے دعوت نظارا دیتا ہے- شاہ بھٹائی کے متعلق اس سے پہلے بہت کچھ کہا جاچکا ہے- جس سے ان کے حالات اور کلام پر بہت روشنی پڑتی ہے- لیکن ظاہر ہے کہ اتنی بڑی شخصیت کا کوئی جائزہ بھی اس قدر جامع نہیں ہوسکتا کہ وہ اسکے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو- جوں جوں ان کے متعلق دلچسپی بڑھتی جاتی ہے اتنی ہی ان کے بارہ میں مزید معلومات کی مانگ بڑھتی جاتی ہے- ان کی حیات- ان کی شخصیت اور کلام کے متعلق بہت سی گتھیاں سلجھائی جاچکی ہیں- لیکن کئی ایسی ہیں جو ہنوز ہمارے ذوق گرہ کشا کی منتظر ہیں- یعنی وہ آواز جو آج سے دو ڈھائی صدیاں پہلے سر زمین سندھ میں بلند ہوئی تھی- کیا تھی؟ شاہ لطیف کا پیغام کیا تھا؟ انھوں نے زندگی کو کس نقطہ نظر سے دیکھا؟ کیا وہ فلسفی تھے؟ کیا ان کی مقبولیت کا سبب یہ تھا کہ ان کی آواز اسلام کی آواز تھی؟ کیا وہ عارف اور "دانائے راز" تھے اور ان کی پرواز آنسوئے افلاک تھی؟ کیا وہ صوفی تھے؟ کیا ان کی عظمت و جلال میں ان کے ماورائی تصور کو دخل ہے؟ کیا ان کا تصور ماورائی تھا بھی یا نہیں؟ کیا وہ عوام کے شاعر اور عوامی زندگی کے عکاس تھے اور یہی ان کی مقبولیت کا حقیقی سبب ہے؟ کیا وہ ایک انسان اور صرف انسان تھے- جس کے دل کی دھڑکنیں اپنے ابنائے جنس کیلئے تھیں؟ کیا وہ کسی خاص مذہب و ملت کے شاعر تھے یا تمام نوع انسان کے شاعر- ہمدرد اور بہی خواہ؟ کیا ہم انؑ کے عرفان و بصیرت اور تصوف کو حکیمانہ تصوف قرار دے سکتے ہیں؟ ان کی فکر روایات پر پروان چڑھی یا اپنی اپج سے منتہائے کمال کو پہنچی؟ وہ کیا امور ہیں جو ان کی شخصیت اور کلام کو قدآور بناتے اور منفرد حیثیت عطا کرتے ہیں؟

یہ سوالات ایسے ہیں جن کا جواب "شاہ جو رسالو" میں پوری طرح ڈوب کر ہی دیا جاسکتا ہے۔ ہمیں اسکے لئے ایک ایک لفظ کی روح اور کلام کے معانی بین السطور کا سراغ لگانا پڑے گا۔ میں دل ہی دل میں ڈرتا ہوں کہ مجھے اپنے موضوع سے وہ قرب حاصل نہیں جو ہونا چاہئیے۔ تراجم کے ذریعہ سے بالواسطہ شناسائی اس درجہ محرمانہ نہیں ہوسکتی کہ ہم کسی شخص کے بارہ میں کوئی بات پورے وثوق سے کہہ سکیں۔ خود شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ اگر ہم سمندری سفر پر روانہ ہوں جس میں خطرات ہی خطرات ہیں۔ تو ہمیں پوری تیاری کے ساتھ روانہ ہونا چاہئیے۔ اور یہاں اسکے برعکس بالکل بے سر و سامانی ہے۔ پھر بھی اس سلسلہ میں شاہ صاحب ہی کا ایک اور ارشاد حوصلہ افزا ہے۔ وہ ایک الھڑ لڑکی کا ذکر کرتے ہیں جو خراب کھردری روئی لے کر کاتتی ہے۔ حالانکہ اسکے چرخے کا تکلا بھی ٹیڑھا ہے۔ وہ پوچھتی ہے۔ میرے کاتے ہوئے سوت کو کون مول لے گا؟ وہ بیچاری اچھی طرح کاتنا بھی نہیں جانتی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ "اچھا اسے خراب روئی ہی کاتنے دو۔ اس کا کاتنا بھی بھدا ہی سہی لیکن سوداگر اس کا سوت بھی مول لے ہی لیں گے"۔

اور پھر یہ سفر کچھ ایسا بے سنگ و میل بھی نہیں۔ اور نہ رہنماوں کی اس قدر کمی ہے۔ انسان راہ و مقام سے کتنا ہی نابلد سہی پھر بھی کچھ تراجم اور کچھ سندھی زبان میں شد بد اسکی کافی رہنمائی کرسکتے ہیں۔

چوں عشق حرم باشد سہل است بیاباں ہا

سب سے پہلے مشاہدہ حق کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ جو ہر تخلیق اور ادب و فن کے تمام مظاہر میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اس پر اسرار چیز کا سر چشمہ ہے جسکو ہم فیضان قرار دیتے ہیں۔ کہیں صاحب فن کی طبیعت کی گہرائیوں میں ایک تحریک پیدا ہوتی ہے اور مجازات کی شکل میں بروئے کار آتی ہے۔ اس کا تعلق بالاخر انسان کے زاویہ نگاہ سے ہے۔ اور شاہ عبداللطیف کا زاویہ نگاہ بلا شبہ عارفانہ ہی تھا۔ انکا ہر ہر بول اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے۔ کہیں وہ جوگیوں یعنی مسلمانوں کی اصطلاح میں درویشوں اور مومنوں کا ذکر کرتے ہیں اور کہیں "ساکنان لاہوت" کا تزکرہ فرماتے ہیں۔ ان کے کلام میں جابجا روحانیت ہی پر زور ہے۔ اور ان کی تان رہ رہ کر اسی پر ٹوٹتی ہے۔ وہ روح کی صحت۔ اسکی سلامتی۔ اسکی بقا کے متعلق بہت متفکر ہیں۔ اور یہ روح درحقیقت نفس یا ذات ہی سے عبارت ہے۔ اگر روح محفوظ اور توانا ہے تو سب کچھ محفوظ ہے۔ ہم اسکی بدولت ہر "طلسم غیر" کو توڑ سکتے ہیں۔ لیکن اگر یہ ہماری کسی لغزش۔ کسی خامی کی وجہ سے محفوظ نہیں رہی۔ اگر ہم کسی داو میں روح کو ہار جائیں تو پھر ہمارا سنبھلنا بہت دشوار اور بعض حالات میں نا ممکن ہے۔ ہم ایک ٹوٹے ہوئے شہپر کے ساتھ کبھی پرواز نہیں کرسکتے۔ اس سلسلہ میں شاہ صاحب نے متعدد تمثیلوں۔ قصوں اور کرداروں سے کام لیا ہے۔ اور بار بار اس نکتہ کی توضیح کی ہے۔ لیکن کیا یہ تصور واقعی ماورائی ہے؟ میرا مطلب ہے۔ کیا ہم یہ تسلیم کرلیں کہ شاہ صاحب ایک عارف صفت ذات ہیں؟ ان کا مسجود سرحد ادراک سے پرے ہوتے ہوئے زندگی اور دنیا و مافیہا

سے بھی پرے ہے؟ یعنی وہ بالکل ہی "غیب غیب" ہے- اور شاہ صاحب کا مسلک خالص تجریدی مسلک ہے- گویا انسان تمام تر ایک ہستی غائب میں کھو جاتا ہے- ایسا مسلک یقیناً مابعدالطبیعی بن جاتا ہے جس میں دلچسپی بالکل خیالی ہو- توحید ایک زندہ- متحرک قوت نہیں رہتی بلکہ ایک بے رنگ میکانکی چیز بن جاتی ہے- بعض صوفیا کا مشرب اسی قسم کی نظری حق پرستی پر مشتمل ہے- اس لئے ان کی ذات الٰہی تے رسم و راہ اسکے ساتھ تمام تر خلوتیانہ راز و نیاز بن جاتی ہے- جس کا جلوت یا انسان کی اپنی زندگی سے کوئی اخلاقی یا حرکیاتی تعلق نہیں رہتا- شاہ بھٹائی کو عارف یا صوفی قرار دینے میں ایک بڑا اندیشہ یہ ہے کہ ہم ان کو محض درویش یا زاہد نہ سمجھنے لگ جائیں- یا ایسا صوفی تصور کریں جو ایک خلا میں زندگی بسر کرتا ہے- کیونکہ ایک خیالی ذات میں جو درحقیقت نرا تصور ہے- محو ہوجانا- حقیقی معرفت سے بہت دور ہے- ہمیں اس بصیرت- عرفان- وجدان- نور باطن اور فنافی‌اللہ کو جو منفی حیثیت رکھتا ہے- مثبت عرفان سے ممیز کرنا پڑے گا- دراصل ہمارے یہاں بعض روحانی واردات کے متعلق بڑا مغالطہ ہے- جسکو دور کرنا بہت ضروری ہے-

یہاں فنا کی صوفی عقیدہ اور اس کے مضرات کی طرف توجہ دلانا مقصود نہیں- دراصل اس عقیدہ کے بارہ میں بھی بہت غلط فہمی ہے- فنا فی نفسہ قطعاً مضرت رساں نہیں کیونکہ اسکے معنی یہی ہیں کہ انسان اپنے آپ کو ایک نصب‌العین سے کلی طور پر منسوب کرلے اور اس میں مدغم ہو کر بالکل ویسی ہی خاصیت پیدا کرلے-

مرد حق آخر سراپا حق شود

یہ فنا درحقیقت بقا ہے- کیونکہ اس سے انسان اپنے نصب‌العین کے اوصاف پیدا کرلیتا ہے- اس سے نفی ذات لازم نہیں آتی- بلکہ اسمیں ایک بلند تر ذات کے اوصاف پیدا ہوکر اسے مضبوط تر بنادیتے ہیں- اور یہی عقیدہ توحید کی اصلی روح اور غرض و غایت ہے- ظاہر ہے کہ جب تک یہ عقیدہ ہمارے نفس- ہمارے اعمال اور ہماری زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتا- یہ محض مسئلہ علم کلام یا سیمیائے خیال ہے-

یہی بنیادی غلطی ہے جس نے سنائی- رومی- حافظ- جامی اور دیگر صوفیائے کبار کے بارہ میں ایک شدید غلط فہمی پیدا کردی ہے- چنانچہ ہم ان سب کو فنا کا حامی قرار دے کر مطعون کرتے ہیں- درحقیقت یہ سب لوگ اس اعلیٰ روحانیت کے قائل تھے جو ایک ذات کبریائی اور بلند ترین منبع اخلاق میں مدغم ہونے سے پیدا ہوتی ہے- اور انتہائی توانائی کی حامل ہے- چنانچہ رومی کے بارہ میں بعض اہل نظر کو دلائل و شواہد پیش کرنے پڑے کہ جس فنا کا وہ قائل ہے وہ درحقیقت بقا ہے- اور اس کا مشرب حرکیاتی ہے- یعنی اسکی معرفت توانا روحانیت اور الٰہیت کی آئینہ دار ہے- یہ وہی چیز ہے جس کو اقبال خودی یا مسلمان خودی قرار دیتے ہیں- اور اسکے نتیجے میں جو حرکی مشرب پیدا ہوتا ہے- اس کو ایک قوی روحانیت یا ایمان قرار دینا چاہئیے- خلیفہ عبدالحکیم اور اس سے بھی زیادہ اطالوی مستشرق السنیدرو برزانی نے بڑی تحقیق سے رومی کے

بارہ میں اس مغالطہ کو دور کیا ہے- یقیناً کسی مسلک کا روحانی ہونا اسکے خلاف حیات ہونے کی دلیل نہیں- بلکہ یہ تو اسکی توانائی کی علامت ہے- یہی کیفیت سنائی- رومی- حافظ اور جامی وغیرہ کی ہے- اس سلسلہ میں مغالطہ تمام تر "خودی" فنا "حیات" اور "عمل" جیسی اصطلاحوں سے پیدا ہوا-

صوفیائے کبار کی "نفی خودی" جس کے شاہ بھٹائی بھی قائل ہیں- ہرگز نفی ذات یا فنا نہیں- بلکہ اسکی بقا ہے- اور خودی یعنی مسلمان خودی- الہیاتی خودی وہی چیز ہے جسکو صوفیہ نفس یا روح قرار دیتے ہیں- اور عملی- اخلاقی عملی- الوہی عملی درحقیقت ایمان ہے- لہذا شاہ بھٹائی کو فنا مشرب قرار دینے سے حقیقی روحانیت کی نفی لازم نہیں آتی- بلکہ اسکی تائید ہوتی ہے- اسطرح تصوف کے ڈانڈے اسلامی روح سے جا ملتے ہیں- اور اگر کوئی فرق باقی رہ جاتا ہے تو یہ کہ صوفیا کی روحانیت خالص قسم کی روحانیت ہے جس میں خالص اخلاق و روحانی اقدار سے واسطہ ہے اور اس میں ظاہر پرستی کا شائبہ نہیں جس سے عام اہل شرع کا دامن داغدار ہے- شاہ بھٹائی اس اعلیٰ قسم کی اسلامی روحانیت کے قائل تھے جو خالص الہی تصور سے پیدا ہوتی ہے- ایسا تصور جس میں اخلاقی اور الہیاتی قدروں کو دخل ہو- ہم زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ ان کا عرفان تصوف کے بجائے دین سے زیادہ قریب تھا- اسطرح شاہ بھٹائی کی روحانیت کی صحیح تعین کرنے سے ان کے عرفان اور باطن پرستی کے بارہ میں ہمارا تصور یک قلم تبدیل ہوجائے گا- ہم انھیں اکثر صوفیائے کرام کی طرح اقبال کا ہمنوا پائیں گے- چہ جائیکہ ہم انھیں بالکل مختلف تصورات کا حامی قرار دیں- البتہ مقامی یا جبلی اختلافات کے سبب ہم اس مشرب کے مختلف حامیوں میں نمایاں فرق پاتے ہیں- مسٹر سورلے نے اپنی کتاب کے شروع میں بالکل درست کہا ہے کہ شاہ بھٹائی کے کلام میں رومی کی سی شان جلال نہیں- نہ جامی کی وجدانی نغمگی ہے اور نہ حافظ کا طنطنہ- بلکہ اسکے ساز سے تو دھیمے- میٹھے میٹھے نغمے ابھرتے ہیں- اور خواہ یہ بظاہر عجیب معلوم ہو لیکن ان بولوں میں وہی پر اسرار- ساحرانہ سکون ہے جو اسلام کے عمیق حکیمانہ ارشادات کی روح و رواں ہے-

ان سطور سے یہ بخوبی واضح ہوگیا ہوگا کہ شاہ بھٹائی کا عرفان کوئی خیالی بھول بھلیاں نہیں- بلکہ وہ حقیقی روحانی قدروں اور زندگی کا دوسرا نام ہے- ہم اسکو تصوف اسی بنا پر قرار دے سکتے ہیں کہ وہ اپنا دامن ایک الوہی ذات کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں- ورنہ یہ تصوف نہیں بلکہ اسی قسم کی روحانی زندگی ہے جس کا پرچار اقبال نے کیا ہے- ہم اس مسلک کے صرف اس پہلو کو پیش نظر رکھتے ہیں جو ذات باری سے متعلق ہے اور اس پہلو کو نظر انداز کردیتے ہیں جو انسانوں سے وابستہ ہے- اگر ہم یہ دیکھیں کہ اس کا انسانوں اور ان کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے اور کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں تو اس مغالطہ کا کوئی امکان باقی نہیں رہے گا- ہم یہ محسوس کریں گے کہ یہ مشرب درحقیقت انسانی مشرب ہی ہے- ذات باری کے زیر اثر ایک روحانی مشرب- یہ جتنا آسمانی ہے اتنا ہی زمینی بھی ہے- شاہ بھٹائی ہمیں خدا کے پاس لے جاکر روح

سے دور نہیں بلکہ اسکے قریب لے جاتے ہیں- وہ ہماری زندگی- ہماری روح کی تقویت کرتے ہیں تاکہ یہ دنیا کے تمام حوادث کا پوری جمیعت سے مقابلہ کرسکے اور اپنی جبلی قوتوں کا بہترین مصرف پیدا کرے-

ان توضیحات کے بعد ہم سمجھ سکتے ہیں کہ شاہ بھٹائی روح پر اتنا زور کیوں دیتے ہیں- اور روح پر زور دینے سے ان کا مطلب انسانی ذات- اسکی خودی- اسکی شخصیت- اسکی زندگی پر زور دینا ہے- جس کو لازماً ایک اعلیٰ وضع کے نمونے پر ذات اور زندگی ہونا چاہئیے- وہ جانتے ہیں کہ قدرت نے انسان کو ایک ہی جوہر عطا کیا ہے- حیات- اسلئے اسکو زیادہ سے زیادہ توانا بنانے سے (جو ذات باری کے ساتھ انا کو وابستہ کرنے اور روحانی فضائل پیدا کرنے ہی سے ممکن ہے)- اسکو تسخیر کے تمام ذرائع ہاتھ آ سکتے ہیں- اگر ہم ذات باری کی جگہ کوئی نصب العین مقرر کرلیں- خواہ وہ مادی ہی کیوں نہ ہو- مثلاً فسطائیت- اشتراکیت تو اسکی روحانی قدریں اور اوصاف اسی خدا کے اوصاف پیدا کرلیں گی اور وہ اپنی صلاحیتوں کو اسی نصب العین کے حصول کیلئے زیادہ سے زیادہ نشو و نما دے گا- یہ تو تمام تر انسان کے تصور حق پر موقوف ہے- لہذا شاہ بھٹائی کا تصور ایک عملی تصور ہے- اس کا محبوب اور وہ معرفت جس کو ہم خیالی اور سیمیائی سمجھتے ہیں- فی الفور ایک عملی نظریہ یا مسلک کا روپ دھار لیتے ہیں-

اگر شخصیت کی توانائی ہی ہمارا مقصود ہے تو پھر ہمیں ان اصولوں پر زور دینا ہوگا- جن سے شخصیت مستحکم ہوتی ہے- اور ان امور سے قطع نظر کرنی ہوگی جو "خودی کو ضعیف" کرتے ہیں- یہی وجہ ہے کہ اپنی تمام نظموں میں خواہ وہ غنائی ہوں یا ڈرامائی- شاہ بھٹائی برابر روح ہی کے گن گاتے ہیں- وہ بار بار سندھ کی ہردلعزیز رومانی داستانوں سے- جن کا گھر گھر چرچا ہے اور جو یہاں کے لوگوں کو قدرتی طور پر مرغوب ہیں- ایسے کردار تلاش کرتے ہیں- جو خودی کی توانائی اور کمزوری کو واضح کریں- وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ انسان میں ایک جذبہ ہو- وہ کسی چیز کو اپنا محبوب بنالے اور پھر اسکے لئے جان تک دے دے- سوہنی- سسی اور سب سے زیادہ ماروی روحانی قوت کی زبردست مثالیں ہیں- یہ محبت کی ماری عورتیں شدید ترین حالات میں بھی محبوبوں کا ساتھ نہیں چھوڑتیں- شاہ بھٹائی ایک معمولی لغزش کے نتائج کو بھی فراموش نہیں کرتے- وہ جانتے ہیں کہ زندگی کی راہ میں ذرا سی بے احتیاطی- ذرا سی بے پروائی- ذرا سی غلطی کیا معنی رکھتی ہے- سوہنی نے ذرا سی بے احتیاطی برتی اور وہ تباہ ہوگئی- سسی تھوڑی دیر غفلت کی نیند سوئی اور اسکا محبوب- اس کا حاصل حیات اسکے ہاتھ سے جاتا رہا اور لیلاں کی ذرا سی طمع نے اسکی تمام زندگی کو المیہ بنا ڈالا- فطرت کی تعزیریں بہت سخت ہیں اور وہ کسی فرد- کسی قوم کو نہیں چھوڑتیں- ہمیں اپنے اعمال کی سزا بھگتنی ہی پڑتی ہے- خواہ وہ کسی شکل میں ہو- ایک ذرا سی لغزش یا خامی اور ہمیں مدتوں اسکا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے- مدتوں اس برائی کے اثر کو زائل کرنا پڑتا ہے- جس نے ہمارے قوائے حیات مضمحل کردئیے تھے- ہمیں کمزور و ناتواں بناکر طوفان حوادث کی آماجگاہ بنادیا تھا- ہم بہ مشکل تمام

مجاہدہ و ریاضت سے دوبارہ روحانی توانائی پیدا کرلیتے ہیں- پھر کہیں پستی سے ابھر کر بلندی کی طرف آتے ہیں- یہاں شاہ بھٹائی کا نقطہ نظر بعینہٖ مسیحی نقطہ نظر بن جاتا ہے- چنانچہ ان مماثلتوں کی طرف ان کے انگریز مترجم مسٹر سورلے نے بھی اشارہ کیا ہے- خود تاریخی واقعات اس نقطہ نظر کی تصدیق کرتے ہیں- اور افراد اور قوموں کی داستان اسکی پوری پوری شہادت دیتی ہے-

شاہ بھٹائی کی ذاتی توانائی سے والہانہ دلچسپی ان کے انداز گفتگو سے ظاہر ہے- ان کا لب و لہجہ ایسے انسان کا لہجہ ہے جسکے دل کو لگی ہو- اور وہ بے اختیار مجذوبانہ انداز میں اپنے دل کی بات کہتا چلا جائے- جہاں وہ اپنے کرداروں کے عزم اور بلند ہمتی پر زور دیتے ہیں ان کے کلام میں ایک عجیب سطوت بلکہ جبروتی شان پیدا ہوجاتی ہے- اور جب وہ ان کی مصیبتوں کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا دل بھر آتا ہے اور وہ سسکیوں- ٹوٹے پھوٹے جلد جلد بولے ہوئے جملوں سے کام لیتے ہیں- سر سوہنی میں ایسے بیشمار بول اور جملے دکھائی دیتے ہیں- ان سے شاہ بھٹائی کی قدرت بیان پر بھی روشنی پڑتی ہے- مسٹر ہادی حسن نے اپنی کتاب (Studies in Persian Literature) میں بجا طور پر شدید المیہ کیفیات کی برجستہ ترجمانی کو قادرالکلامی کا معیار قرار دیا ہے اور شیکسپیئر کے ڈراموں سے اسکی کئی مثالیں دی ہیں- شاہ بھٹائی کے ڈراموں میں اس قدرت بیان کی کئی مثالیں دستیاب ہوتی ہیں- خاص طور پر اضطراری کیفیتوں کی ترجمانی میں تو انھیں خاص ملکہ حاصل ہے- ایسے موقعوں پر ان کا انداز بالکل بروننگ کے کمندوش (Lasso) یعنی افتاں و خیزاں اسلوب کے مشابہ ہوجاتا ہے- اور یہ شاعری کی بہت ہی نادر خصوصیات میں سے ہے- یہ محض بیان کا زور یا شکوہ ہی نہیں بلکہ اس سے زیادہ بلند اور نادر خصوصیت ہے-

اگر شاہ بھٹائی کا نقطہ نظر یہی سیدھا سادا نقطہ نظر ہے تو صریحاً اس میں فلسفہ و حکمت کو کوئی دخل نہیں- اس میں مابعدالطبیعیات کی کوئی موشگافیاں نہیں- اس میں رموز و اسرار کے کوئی خم و پیچ نہیں- اس لئے ان کلام میں کوئی مبہم باتیں نہیں- اور نہ وہ اشارات- استعارات- تمثیلات یا علامات سے کام لیتے ہیں- یہ نہیں کہ ان کے یہاں اچھوتے استعارے یا علامات نہیں- بلکہ وہ اس قدر صاف اور واضح ہیں کہ ہماری نظر ان کی تمثیلیت کی طرف نہیں جاتی- ہمیں ان میں ایک لہک- ایک بے ساختگی- ایک نکھار اور تازگی نظر آتی ہے- یوں تو محبوب حقیقی کے تذکرہ سے لازماً (Allegory) پیدا ہونی چاہئیے- لیکن شاہ بھٹائی کا معہود ذہنی بالکل بدیہی اور قریب ہونے کی وجہ سے اس کا احساس نہیں ہوتا- وہ جو آڑ لیتے ہیں ہم اسکو فوراً بھانپ لیتے ہیں- اور ممثل اور ممثل بہ میں جو امتیاز ہونا چاہئیے وہ محسوس نہیں ہوتا- اسلئے معنوی اور صوری دونوں حیثیتوں سے شاہ بھٹائی کی تمثیلیت برائے نام تمثیلیت رہ جاتی ہے- ہم جانتے ہیں کہ وہ کسی آسمانی یا ماورائی بات کا ذکر نہیں کر رہے بلکہ ہماری اور ہماری دنیا ہی کی باتیں کر رہے ہیں- ان کی فکر اور شاعری نظریات کے گرد و غبار سے آزاد ہے-

وہ ہمارے ذہن پر ایک کثیف دھند بن کر نہیں چھا جاتے۔ بلکہ اپنی ذہنی صفائی ہمیشہ برقرار رکھتے ہیں۔ تاہم جہاں تک اصطلاحات کا تعلق ہے وہ شاہد حقیقی۔ طلب۔ ریاضت اور اسی قسم کے دوسرے مانوس الفاظ برتتے ہیں۔ اگرچہ ان کی تعداد اس قدر کم ہے کہ روایتی استعارات سے بھی رسمیت کی بو نہیں آتی۔ مثلاً وہ یہاں تہاں شراب اور میخانہ کا ذکر کرتے ہیں لیکن جو بیزاری ان کو اردو شاعری میں دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔ شاہ بھٹائی کے الفاظ سے اسکا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ اسکی ایک معقول وجہ ہے۔ شاہ بھٹائی خالص حق کے پرستار ہیں۔ وہ اس کو کسی حجاب کے بغیر دیکھنے کے دلدادہ ہیں۔ وہ ان کی نظر میں منزہ ذات یا اکائی ہے جس میں کوئی تصوف یا دوئی ممکن نہیں۔ گویا یہ دو جمع دو چار قسم کی حسابی اصلیت ہے جس میں قطیعت پوری طرح کارفرما ہے۔ لہٰذا شاہؔ صاحب اسکے لئے جو الفاظ یا تمثیلات تلاش کرتے ہیں۔ وہ بھی تجریدی ہیں۔ ان کا مشاراً الیہ پس پردہ صاف جھلکتا ہے۔ اسلئے ہم ان استعاروں پر نظر نہیں کرتے اور براہ راست ان کی دلالت محسوس کرتے ہیں۔ حقیقت اور مجاز میں جو خلیج حائل ہوتی ہے۔ اسکو شاہ لطیف اپنے ذوق حق پرستی میں بالکل پاٹ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں عبارت آرائی کو کوئی دخل نہیں۔ وہ کسی استعارہ کی رنگ آمیزی۔ رنگیں بیانی یا انداز طرحداری کو پسند نہیں کرتے۔ ان کی طبیعت استعاروں اور تمثیلوں کو بھی اسی قطیعت کے ساتھ استعمال کرتی ہے۔ اور ان کے ساتھ وہی ہندسی سلوک روا رکھتی ہے جو وہ الفاظ سے روا رکھتے ہیں۔ اس قسم کے جنچے تلے۔ نفیس انداز سے ہمیں بے اختیار اناجیل کی یاد آتی ہے۔ اور ہم شاہ صاحب کے جملوں میں انھی کی سی دلفریب سادگی کا عکس پاتے ہیں۔ یہ سادگی غالباً ایک زیادہ قریبی اثر کا نتیجہ ہے۔ میرا مطلب قرآن مجید سے ہے۔ جس میں اصلیت کے ساتھ اسی طرح قدم بہ قدم مطابقت نظر آتی ہے۔ لیکن اسطرح کہ عبارت کی کیف آفرینی اور تخلیقی وضع کہیں ماند نہیں پڑتی۔ دیکھئے ذیل کے پاروں میں اناجیل اور قرآن کا رنگ کس قدر نمایاں ہے۔ لیکن یہ محض تقلید نہیں بلکہ اپجی رنگ میں ہم وضعی یا اثر پذیری کا انداز لئے ہوئے ہے۔

الله جنءِ نالوءِ، تنءِ مون وڏو آسرو،
خالق تنهنجي کاند جو، پرو پاند نہ کو،
نالو رب سندوءِ، رهيو آهہ روح ۾.

منو جنءِ نالوءِ، تنءِ مون وڏو آسرو،
کو در ناہ جهوءِ، مون ٻيا در گهٽا نهاريا.

جيڏو تنهنجو نانءُ، ٻاجھہ بہ ٽيڏيائي مڱان،
زي تنيين، ري توٽيين، تون چپر، تون چانءِ،
کهاڙو کهانءِ؟ توکي معلوم سڀ ڪا.

ایسے کلام میں بالکل زبور کا سا قطعی رنگ پایا جاتا ہے- گویا شاعر کی توجہ نفس الامر پر ہے- شاہ صاحب کا بہت سا کلام اسی سانچے میں ڈھلا ہوا ہے- اور اس سے بہت اونچے پیمانہ پر ہے- فرماتے ہیں:-

"جب میرا محبوب اپنی شان جمال کے ساتھ خراماں ہوتا ہے تو زمین بھی "بسم اللہ" پکار اٹھتی ہے-
دیکھو! جہاں جہاں اس کے پاوں گذریں وہاں راہ بھی بوسہ زن ہوتی ہے-
حوریں ادب سے ایک طرف دم بخود کھڑی ہوجاتی ہیں-
میں قسم کھاکر کہتا ہوں کہ میرے محبوب کا چہرہ سب سے زیادہ حسین ہے"-

یہ پروقار سادگی اس تمکنت اور بلند متانت کا نتیجہ ہے جو شاہ بھٹائی کی طبیعت کی نمایاں خصوصیت تھی- اوپر جو پارے پیش کئے گئے ہیں- ان میں کوئی رکھائی نہیں- بالعموم ایسی عبارتوں میں سپاٹ پن پیدا ہوجاتا ہے- یا وہ بہت بھونڈی- بھدی اور بے کیف بن جاتی ہے- الفاظ حسن سے بالکل عاری ہوجاتے ہیں- اور خشک نثریت سے ذوق آزردہ ہی نہیں بلکہ مجروح بھی ہوتا ہے- دراصل یہ قل و دل کا کھیل بہت نازک ہے- بہت کم طبائع ایسی ہیں جو من و عن بیان پر قناعت کریں یا پھر سپاٹ پن اور "چشمان تو زیر ابروانند- دندان تو جملہ در دہانند" کی پھبتی سے بچ سکیں- نپی تلی مگر پرلطف زبان ذرہ بھر زیب داستان سے بھی پرہیز کرنے کا نام ہے- اور کون ایسا ضابط شخص ہے جو اتنی کڑی پرہیز سے کام لے؟ ہمارے یہاں حالی اس ضبط اور سخت گیری کی عمدہ مثال ہے- لیکن اسکی کامیابی اس وجہ سے نہیں کہ وہ اپنی طبیعت پر قابو رکھتا ہے بلکہ اس میں سرے سے یہ میلان ہی نہیں کہ وہ حد اعتدال سے تجاوز کرے- انگریزی میں ورڈز ورتھ اپنی واقعیت نگاری کیلئے مشہور ہے- لیکن وہ محض سچائی کو پیش کرنے کی کوشش میں پرتصنع سادگی اور بھونڈی رکھائی کی طرف مائل ہوجاتا ہے- اور یہ خصوصیتیں بعض اوقات مضحکہ انگیزی کی حد تک پہنچ جاتی ہیں- گویا شاعر میں وہ لطیف چیز ہے ہی نہیں جسے ذوق کہتے ہیں- لیکن جب یہ سادگی سلجھی ہوئی شکل اختیار کرلیتی ہے تو ہم اس سے زیادہ بے ساختگی اور بے تکلفی کا تصور بھی نہیں کر سکتے- اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ورڈز ورتھ کی بعض نظمیں قدرت نے خود اپنے ہاتھ سے لکھی ہیں- چنانچہ لوسی گرے کا جو کردار اس نے پیش کیا ہے- وہ اس قدر سادہ اور دل میں گھر کرجانے والا ہے گویا قدرت نے ایک بڑی ہی معصوم اور سیدھی سادی بچی کا روپ دھار لیا ہو- لیکن لوسی گرے پھر بھی بچی ہے- وہ پوری عورت نہیں- شاہ بھٹائی کا مسئلہ ورڈز ورتھ سے زیادہ مشکل تھا- انہیں جنسی احساس سے پوری طرح بہرہ ور- معصوم اور وفا شعار عورتوں کے کردار پیش کرنے تھے- اور انھوں نے یہ مہم بڑی کامیابی سے سر کی ہے- سسی- سوہنی اور ماروی بعینہٖ ایسے کردار ہیں- ان میں ماروی کا درجہ سب سے بلند ہے- اس میں شاعر کے تصور نے اپنے انتہائی شوق کے ساتھ ایک مثالی پیکر وضع کر لیا ہے- جو سادہ بھی ہے اور دلدوز بھی- اور پھر اس میں بچوں کا سا بھولا پن

کے معتقدین بڑے ذوق و شوق سے شاہ کی کافیاں سن رہے ہیں

بھی ہے- ان کرداروں میں ایک خوبی اور بھی ہے- لوسی گرے کو صرف اپنے معمولی چھوٹے موٹے فرض انجام دینے تھے- لیکن ان تمام کرداروں کو زندگی کی سنگین سے سنگین افتادوں کا سامنا کرنا تھا- وہ زندگی کے ہنگاموں میں پوری شدت سے شریک تھیں- اس لئے ان کی فطرت کی مصوری نسبتاً کہیں زیادہ دشوار تھی- شاہ بھٹائی کا فن اس آزمائش میں ہر اعتبار سے کامیاب رہا ہے- خصوصاً ماروی کا کردار پیش کرنے میں وہ اپنے فن کی آخری حدوں کو چھوتا ہوا معلوم ہوتا ہے- غرض شاہ بھٹائی کا موضوع ایک ہی تھا- روح کی فتح اور شکست- وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ روح کی جیت کیا ہے اور ہار کیا ہے- انسان کے لئے اپنی روح کو گنوا دینا کیا معنی رکھتا ہے- وہ یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اگر انسان فاوسٹس کی طرح دنیا کا سب کچھ حاصل کرلے لیکن اپنی روح کو کھو بیٹھے تو یہ کتنا مہنگا سودا بلکہ نقصان ہے- ان کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت کردار کو حاصل ہے- یہ تعلیم آج بھی بے انتہا اہمیت رکھتی ہے- کیونکہ نوع انسان کی تمام موجودہ خرابیاں کردار ہی کی کمزوری اور روح کو ہر نرخ پر فروخت کردینے کا نتیجہ ہیں- یہ محض اتفاق ہے کہ یہ تمام افراد عورتیں ہیں- دراصل شاہ بھٹائی کا مقصود بلند انسان یا کردار پیش کرنا ہے-

واضح رہے کہ سسی اور ماروی دونوں ہندو تھیں- ان سے شاہ بھٹائی کی وسیع النظری اور وسیع المشربی اور بھی ظاہر ہوتی ہے- ان کی نگاہ انسانوں میں کوئی امتیاز نہیں کرتی- بلکہ وہ سب کو ایک ہی کسوٹی سے پرکھتے ہیں- کیا وہ زندگی کی کٹھن آزمائشوں میں پورے اترے یا نہیں؟ ان کی طبیعت میں ولولہ- بلندی اور استقامت تھی یا نہیں؟ شاہ صاحب بعینہٖ براوننگ کی طرح ایک کے بعد دوسرے فرد کو اسی سنگین معیار سے پرکھتے جاتے ہیں- اور ان کو کسی نہ کسی افتاد میں پیش کرکے ان کی کردار نگاری کا حق ادا کرتے ہیں- یہاں موقع نہیں کہ ان کرداروں کا تفصیلی ذکر کیا جائے- یہ ایک ایسا موضوع ہے جو ایک مستقل مقالہ کا متقاضی ہے-

شاہ صاحب تمام تر سوز کے شاعر ہیں- ان کی کائنات سوز و گداز کی کائنات ہے- وہ دل کے شاعر ہیں- اور دل ہی کی باتیں کہتے ہیں- وہ کبھی اس پر دماغ کی بوجھل پرچھائیں نہیں پڑنے دیتے- ان کا احساس بہت سادہ ہے- ان کے احساس کی رگیں ابھری ہیں- گتھی ہوئی اور گنجلک نہیں- گویا وہ اس تانپورے کے تار ہیں جس سے وہ کبھی تیور کبھی کومل سریں پیدا کرتے ہیں- ایسے سر جو بسا اوقات کھرج کی حد تک پہنچ جاتے ہیں- ان کی شاعری کی روح ایک گھمبیر سکون ہے- اس میں تمکنت ہے- ہیجان نہیں- ان کی طبیعت انفعالیت یعنی سوز- درد کی طرف مائل ہے- اس لئے ان کے کلام میں بھی ٹھیراو ہے-

ظاہر ہے کہ جو شاعری اس قدر سادہ احساسات پر مشتمل ہو وہ کبھی بھاری نہیں ہوسکتی- اس میں پرکاری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا- شاہ صاحب اس بیان کے قائل ہیں جس میں زیب داستان کیلئے بڑھانے کے بجائے کچھ گھٹا دیا جاتا ہے- اور اس حد تک

کہ اسکے ڈانڈے تجرید سے جا ملیں۔ اسطرح شاعر کا حسن بیان بالاکثر لفظی مفہوم تک محدود ہوکر رہ جاتا ہے۔ شاہ بھٹائی کی فکر پہلے ہی سے ہموار ہے۔ اس لئے اس میں پرکاری کا امکان نہیں۔ چنانچہ شاہ صاحب پرشور لمحات میں بھی نظم و ضبط برقرار رکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سندھی زبان بھی ان کی بہت مدد کرتی ہے۔ کیونکہ اسمیں ہندی۔ پنجابی اور دکھنی کی طرح ایک عجیب بے ساختگی ہے۔ ان سب زبانوں کی ایک خاص بناوٹ ہے۔ بے حد سادہ اور بے تکلف۔ جیسے یہ سب دھرتی کی اپنی زبانیں ہوں۔ ان سے صاف دھرتی کی سگندھ آتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ انسانوں کے دل سے ابھری ہوں۔ یہ سوز سے بہت قریب ہیں۔ شاید اسی طبعی میلان کی وجہ سے ان میں شاعری بھی عورت کی طرف سے ہوتی ہے۔ اور جو نازک باتیں اسکی زبان سے ادا ہوجاتی ہیں وہ دوسری سنجیدہ اور مہذب زبانوں سے ممکن نہیں۔ چنانچہ شاہ بھٹائی نے جو رچا ہوا سوز اور رقت سسی۔ سوہنی۔ ماروی اور لیلاں وغیرہ کے دل سے نکلے ہوئے بولوں میں پیدا کی ہے۔ ان کے الفاظ کو شاعری کی دنیا سے نکال کر سچ مچ کی پکار بنادیتی ہے۔ خصوصاً ماروی کو پڑھ کر ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ ڈرامہ یا سخن آفرینی ہے۔ کیونکہ شاعر کے الفاظ سچ مچ کسی دکھ کی ماری کے درد بھرے بول معلوم ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب نے سادگی کا کا ذوق فارسی کی بجائے دیسی شاعری سے پا ہے۔ انھوں نے بعض شاعروں کی طرح مانوس یا عام بول چال کو برتنے کے بارہ میں کوئی نظریہ وضع نہیں کیا۔ بلکہ اپنے فطری ذوق ہی کو رہنما بناکر ہر طرح کے اثرات پیدا کئے ہیں اور وہ بڑی آسانی سے اس شکوہ کو پالیتے ہیں جو بالعموم بلند بانگ الفاظ سے پیدا کیا جاتا ہے۔ ذیل کے پاروں میں سادہ الفاظ ہی سے کس قدر سطوت پیدا کی گئی ہے۔

"اے بہنو! میں اپنے محبوب کے بغیر بیمار ہوں۔ اگر میں اپنے حال کا ایک شمہ بھی بیان کروں تو جانوروں پر سکتہ طاری ہوجائے۔ پہاڑ پاش پاش ہوجائیں۔ درخت جل جل کر راکھ کا ڈھیر بن جائیں اور دنیا میں گھاس کی ایک پتی تک نہ اگے۔ میں جھاڑ جھنکاڑ سے پرتھلوں کو کیا جانوں۔ کہتے ہیں۔ دنیا میں بن کے بن پھیلے ہوئے ہیں۔ آجا! میرے پیارے آجا! میں تھلوں میں چلتے چلتے تھک گئی۔ میرے پتی! مجھے برباد نہ کر۔ مجھے یوں راہ میں نہ چھوڑ دے۔ مجھے جھاڑیوں سے پر بن میں نہ چھوڑ دے۔ میں پانی کا گھونٹ تک نہیں پی سکتی۔ دیکھ یہ پہاڑیاں مجھ پر کیسے لپک لپک کر حملہ کرتی ہیں۔ اور گرمی کسطرح ٹوٹی پڑتی ہے۔ - - - - آ- آ- اے میرے ساجن!"

کیا ان پاروں میں انگریزی کے بہترین سانیٹرن کا انداز نہیں جھلکتا؟ لیکن ان کی آزاد ہیئت اور لوچ سانیٹ کی پابندی سے بے نیاز ہے۔ اس سطوت کی ایک عمدہ مثال شاہ بھٹائی کی بارش پر متعدد نظمیں ہیں جن میں کوئی گھن گرج نہیں پھر بھی ہم سادگی کے ساتھ ساتھ ایک عجیب شان جلال محسوس کرتے ہیں۔ بادلوں کے متعلق نظمیں

شاہ لطیف کے غیر فانی شاہکار ہیں- اور ان کی غنائی نظموں میں سب سے بلند درجہ رکھتی ہیں- سادہ فطرت نگاری اور چلبلے پن کے سلسلہ میں ورڈز ورتھ کی یہ نظم بہت مشہور ہے:-

"پرند اڑتے ہیں- کوئل کوک رہی ہے-
پہاڑوں میں خوشی ہی خوشی ہے-
فوارے خوشی کے مارے ناچ رہے ہیں-
لو- برف الٹے پاوں لوٹ گئی- جیسے کوئی ہاری ہوئی فوج"-

اسکے مقابلہ میں شاہ بھٹائی کا ہر ہر پارہ کتنا سادہ اور کتنا شاندار ہے- اس میں کیسا ٹھاٹھہ ہے- اور پھر زندگی کی ایسی برجستہ عکاسی اور چلبلا پن:-

"ساون کی رت آئی- قہقہے اور چہچہے بلند ہوتے ہیں-
کوئل کی تیکھی تیکھی کوک فضا کو چیرتی ہے-
ہاریوں نے ہل جوت لئے- گڈرئیے خوش ہیں-
برکھا کی رت آ گئی- خوشی کے چہچہے اور میٹھے میٹھے زمزمے بلند ہوئے-
بادلوں کے دل کے دل نمودار ہوئے- اناج سستا ہوگیا-
مٹکے مکھن سے بھر پور ہوگئے"-

یہ نظم جسے گیت کہنا چاہئیے عوام سے کس قدر قریب ہے- یہ محض کسی درویش خدا مست کا کلام نہیں ہو سکتا- یہ تو ایک ایسے شاعر کا کلام ہے جو خدا کے ساتھہ خدا کے بندوں سے بھی پیار کرتا ہے- اور ان کی زندگی سے گہری دلچسپی اور گہرا لگاو رکھتا ہے- وہ انہی میں سے ایک ہے- اور اسکی دنیا یہی چلتی پھرتی دنیا ہے-

برسات پر ایک اور نظم کا انداز بعینہٖ مغربی ہے- اور اس میں ایک عجیب سطوت ہے جس پر مقامی رنگ کی خوب چھوٹ پڑ رہی ہے:-

"بجلیاں تیزی سے بلندیوں پر دوڑ اٹھیں اور استنبول پر جا چمکیں-
انھوں نے مغرب کی راہ لی- وہ خطا پر چمکیں دمکیں-
انھوں نے سمرقند کو اپنی بھرپور سہانی یاد سے نورٌعلیٰ نور کردیا-
یہ بجلیاں روم اور کابل کو گئیں اور قندھار تک پہنچیں-
دہلی پر ایک کڑکتا بادل گرج اٹھا اور دکن کے وسیع میدان پر پھیل گیا"-

دیگر امور سے قطع نظر اس کا کینواس کتنا وسیع ہے اور شاعر نے کس چابکدستی سے تمام دنیا کو اپنے احاطے میں لے لیا ہے- اس نے اشاروں ہی اشاروں میں تمام کرہ خاک کا مکمل نقشہ نظروں کے سامنے لہرا دیا ہے گویا یہ کوئی طلسمی راج محل ہو- یہ کمال فن ہمیں انگریزی شاعر کیٹس کے مشہور سانیٹ کی یاد دلاتا ہے جس میں ہومر کی تعریف کرتے ہوئے تمام پہنائے گیتی کا ایک طلسمی ہیولیٰ مرتب کردیا گیا ہے-

ان امور سے ہماری توجہ قدرتی طور پر شاہ بھٹائی کی شاعری کی طرف منعطف ہوتی ہے۔ جس کو عموماً نظر انداز کردیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں کچھ رسم سی بن چکی ہے کہ معانی کو خارجی ہیئت پر فوقیت دی جائے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ نفس شعر کیفیت باطنی ہے نہ کہ ہیئت۔ بلا شبہ ابتدا میں خیال ہی ہوتا ہے۔ لیکن ہم خارجی لوازم کو محض ہیئت کیوں قرار دیں؟ انھیں بھی قوت تخلیق کی پیداوار کیوں نہ سمجھا جائے؟ آخر محاکات۔ تکنیک اور اسلوب بھی تو شعور اور صناعانہ قوت ہی کے مظاہر ہیں۔ الفاظ۔ ان کی نشست و ترتیب۔ اسالیب اور محاکات سے شاعر کا ذوق۔ اسکی شخصیت ظاہر ہوتی ہے۔ درحقیقت کسی فن س میں بھی شخصیت یا مواد فی نفسہ مقصود فن نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ شخصیت یا مواد جو کامیابی سے پیش کیا گیا ہو۔ مقصود فن ہے۔ اسی کو اصطلاح میں فن برائے فن کہا جاتا ہے جس کا مفہوم عام طور پر بہت غلط سمجھا جاتا ہے۔ اگر ہم فن کی صحیح قدر کرنا چاہیں تو ہمیں تجریدی پہلو سے قطع نظر کرکے واردات قلب کو حسی پیرایہ میں مشاہدہ کرنا پڑیگا۔ جو فن کیلئے لازم ہے اور یہیں شاہ بھٹائی کی حقیقی کامیابی ظاہر ہوتی ہے۔ اگر وہ محض عارف ہوتے یا واردات قلب ہی کو پیش کرتے تو وہ ہرگز اس قدر کامیاب اور مقبول نہ ہوتے۔ درحقیقت یہ شاعر بھٹائی ہی تھا جس نے عارف بھٹائی کو لازوال بنادیا۔ اور شاعر بھٹائی مفکر پر یقیناً اولیٰ ہے۔ یہ بڑی ستم ظریفی ہے کہ عام تصور میں عارف بھٹائی شاعر بھٹائی پر اس قدر چھاگیا ہے کہ ہم عارف ہی کو جانتے ہیں۔ شاعر کو نہیں جانتے۔ آئیے ہم چند لمحے اس شاعر کی صحبت میں بھی بسر کریں۔

ہم اسکے ایک دو تیور تو دیکھ ہی چکے ہیں۔ یہ کہ وہ کس قدر سادگی پسند اور فطرت پرست ہے۔ انھی سے ہم اس کے اسلوب کی دیگر خصوصیات کو بھی بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ شاہ صاحب شوخی بیان سے اس حد تک گریزاں ہیں کہ وہ استعاروں اور تمثیلوں کو بھی بڑی قطعیت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً:۔

"میں نے نخل دار سے اس بھلائی کا مزا چکھا جو میرے غم اپنے ساتھ لائے"۔
اور دار - - - یہ تو دنیا کے تانے بانے ہی میں شامل ہے۔
جدائی کے دریا کی موجیں چھا جاتی ہیں۔
اور ایک ایک جان کو چن چن کر ڈبو دیتی ہیں"۔

اسطرح ان کے استعارے اور تمثیلیں قفل ابجد کی طرح ہیں کہ ایک بار حروف کی صحیح ترتیب قائم ہوئی اور وہ کھل گیا۔ اسکے بعد اور کسی طلسم کاری کی گنجائش نہیں رہتی۔ جب شاہ صاحب کا تخیل بہت ہی رنگ آمیزی کرتا ہے۔ تو پھولوں کو انگاروں اور کانٹوں کو سیخ قرار دیتا ہے۔ یا پھر وہ اس قسم کی ہلکی پھلکی تراکیب وضع کرتے ہیں۔ خبر سحر گہی۔ سرشار شراب۔ خطرہ ساحل۔ انبوہ گل۔ جوق در جوق پرواز۔ لغزش پا۔

سارسوں کی برادری- عشق زائیدہ غم- استعارہ شاہ بھٹائی کے نزدیک ایک تصرف بلکہ تکلف ہے- وہ بالعموم الفاظ کے برجستہ استعمال ہی سے اثر پیدا کرتے ہیں- مثلاً:-

"کہتے ہیں صحرا ہی صحرا دور دور تک پھیلا ہے"-

ان کے یہاں زیب داستان کی کوشش کسی بڑی ہی سیدھی تشبیہ پر ختم ہوجاتی ہے:-

"میں صحرا میں مر جاوں جیسے کوئی تیتر مر جاتا ہے"-

استعارہ کی حد غالباً یہ ہے:-

"اے میرے غمو! میں اپنی خوشیوں کے پیڑ کو کونپل کونپل پھلتے پھولتے نہ دیکھ سکی-

میں غم کی شاخ سے توام ہوں-

میں گالوں سے ساری رات آنسو بہاتی رہی"-

جب تک مہر کی روشنی دستہ دستہ نظر نہ آئی"-

مجھے یقین ہے کہ یہاں بھی شاہ صاحب اپنی سادہ پسندی کی وجہ سے مہر کے بجائے سورج ہی استعمال کرتے- کیونکہ اسمیں کوئی سج دھج نہیں-

ان چند استعاروں اور ترکیبوں کو دیکھ کر جو سادگی میں بھی پرکاری کا روپ لئے ہوئے ہیں- ہمیں یہ شوق گد گداتا ہے کہ ہم سندھ کے بہتے پانی میں ایسے اور بھی گھونگھے اور سیپیاں تلاش کریں- جو اپنی سادگی میں بھی ایک عجیب بانکپن اور انداز طرحداری لئے ہوئے ہیں- مثلاً:-

"ہزار ہا ہزار انبوہ- غریبی کا زنگار- بڑی بڑی بوندوں والی برکھا- (عربی میں باران وابل)- بالوں کی طرح کالے بادل- بارش کا طغیان- بادل برجوں کی طرح اٹھتے ہوئے- برکھا کے دیوتا نے گھڑوں کے گھڑے خالی کردئیے- دوست ساون کے بادلوں کی طرح اکٹھے ہوگئے- وابستہ خیال- کہر کی چادر- سنگت میں اڑان- غموں کی امیری- زہر تمنا- روحانی خرام- شعلہ پنہاں- غموں کی زبان- سفر رفتہ- کف لبریز غم- سلگی قبائے لالہ- نکہت گریزاں- ترکمان وحشی- پھرتے ہو جرگہ جرگہ- دریوزہ نوازش- عشرت شبانہ نوحہ تمنا- مشاطہ بہاراں- نامراد جلوے- احوال برشگالاں- شام بدگمانی- گنبد تحیر- آوازہ جرس- نادان خواب- ہولناک پہاڑوں کی تلچھٹ تک چھان مارونگا"-

اس سلسلہ میں بعض اچھوتے مشاہدے بھی ہماری نظروں کے سامنے آتے ہیں- ان مستقل مناظر سے الگ جن کو شاہ بھٹائی مستقل تمثیلات (ملاح- کاتنا- مے و میخانہ- راہبر- چارہ گر وغیرہ) کے طور پر کام میں لاتے ہیں- جیسا کہ سورلے نے لکھا ہے- ان کی تعداد اتنی زیادہ

نہیں اور نہ ماحول یا زندگی کی قلمی تصویریں پیش کرنے کی دانستہ کوشش ہی کی گئی ہے۔ پھر بھی شاعر کی نگاہ نے جو چند اچٹتے مشاہدے کئے ہیں۔ وہ اسکے گرد و پیش کی جھلک پیش کرتے ہوئے اسکی تازگی نظر کے بھی شاہد ہیں۔ مثلاً ۰۔

"بھٹی کے سینے میں انگارے بھڑکتے ہیں۔
لیکن اس کا دھواں ذرا بھی باہر نہیں آتا۔

وہ گڑھے جو لوگوں نے کبھی کھودے تھے پانی سے بھر گئے۔

گھاس پھونس کی کٹیا سرما کی تند ہوا کے سامنے کیسے ٹھیر سکتی ہے۔

کسی نہ کسی طرح گھڑے کا نچلا کنارہ بھٹی میں پک رہا ہے۔

میں سوئی پڑی تھی کہ میرے دل میں محبوب کی محبت کی بیل اگ پڑی۔

اتنی عمر بچھڑے ہوگئی جتنی پہاڑوں کی عمر ہے۔

لوگوں نے جھاگ ہی کو دیکھا اور دودھ کو نہ چکھا۔

سارس جھرمٹ بناکر اڑ گئے۔

میرے ناچیز جسم کی بھٹی سے محببت شعلے بن بن کر لپکتی ہے۔

سورج کی کرنیں شاخ در شاخ ہوکر گتھ گئیں۔

ریشمی لباس جو کاک کے بادل کی طرح تھا۔

ایک آخری نظر کے طور پر ہم اس نظم میں شوخی فکر اور شکوہ بیان کی وہ تجلی ریز نمود پاتے ہیں جو ہم پر ایک نہایت دیر پا جمالیاتی اثر چھوڑتا ہے ۰۔

"پھر رخ دلدار سے پیدا ہے شان التفات
کھیلتی ہے روئے روشن پر تبسم کی ضیا
میرے کاشانہ میں آتا ہے وہ جان نوبہار
ہر قدم پر کیف و رنگ و نور برساتا ہوا
کون کہتا ہے مہ تاباں کو اس رخ کا حریف
چودھویں کو گرچہ اس کا پیکر آئینہ فام
تابناکی میں پہنچ جاتا ہے تا اوج کمال
پھر بھی خورشید درخشاں سے ہو کیسے ہمسری
ذرہ کیسے روکش خورشید عالم تاب ہو

میرے گھر میں غلغلہ ہے آمد محبوب کا
شادیانے بج رہے ہیں۔ گونجتے ہیں زمزمے
کل جہاں کو رشک ہے میری سعادت پر تو ہو
اب زمانہ میں ہوں لاکھوں مہر تاباں آشکار
اور ہزاروں چاند سیمائے فلک پر جلوہ کار
مجھ کو ذات حق کی شان کبریائی کی قسم
گر نہ میرے روبرو ہو وہ رخ عالم فروز
ہر طرف چھائی نظر آئیں گی تا حد نظر
میری آنکھوں کو بھیانک رات کی تاریکیاں

اے نگار شب یہ کم جلوہ سبک پیکر ترا
کیسے ہو سکتا ہے اس محبوب یکتا کا مثیل
جبکہ اس کا پیکر زریں جہاں افروز ہے
اسکے حسن پر تجمل میں تب و تاب دوام
اور تو۔ تیری تجلی۔ حلقۂ شب کی اسیر
صبحدم جاگوں تو ہو میری نگاہ بیقرار
اے مرے محبوب! تیرے روئے عالمتاب پر
ہر نفس ہو گرد شمع رخ نگاہوں کا طواف
کاش پہنچادے کوئی تجھ تک یہ میری آرزو
یہ مرے دل کا پیام"۔

شاہ بھٹائی کے کلام میں غیر معمولی جدیدیت پائی جاتی ہے اور اسکے ساتھ عالمگیری بھی۔ وہ قرون وسطیٰ کے شاعر ہی سہی۔ اور وہ بھی مشرق کے لیکن ان کا انداز۔ ان کا لب و لہجہ حیرت انگیز طور پر جدید ہیں۔ اگر بعض تلمیحیں اور علامات دور کردی جائیں تو بڑے سے بڑا تیز بیں نقاد بھی یہ معلوم نہیں کرسکےگا کہ یہ ایک مشرقی شاعر کا کلام ہے۔ اور باتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے جن کا سلسلہ بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ میں آخر میں دو اور باتوں کا ذکر کروں گا۔ ایک شاہ صاحب کی غیر معمولی غنائی قوت اور دوسرا ان کا ڈرامائی ملکہ۔ یہ دونوں اہلیتیں ایک ہی شاعر میں بہت کم جمع ہوتی ہیں۔ شاہ بھٹائی میں یہ دونوں اونچے پیمانے پر موجود ہیں۔ ان کی تمثیلی نظموں میں یہ معراج کمال کو پہنچتا ہے۔ ڈراموں کی ایک نرالی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں مسلسل قصہ گوئی کے بجائے جستہ جستہ افتادوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ وہ بھی کسی ترتیب سے نہیں۔ اس انداز کی بلیغ ایمائیت ظاہر ہے۔ کیونکہ شاعر ترتیب کا کام قاری پر چھوڑتا ہے۔ یہ بروننگ کے اکالموں (Dramatic Monologues) نہیں اور نہ فروئے (Soliloquies) کیونکہ ان میں کوئی پلاٹ یا تقریر نہیں۔ ہم انھیں ایک سلسلہ فکر یا تاثرات قرار دے سکتے ہیں۔ جو ڈرامائی انداز لئے ہوئے ہے۔

شاہ بھٹائی کا افسانوی ذوق ڈراموں کے علاوہ متفرق قصوں اور بیلاڈوں (Ballaus) میں بھی ظاہر ہوا ہے- یہ بھی ان کی شاعری میں مزید دلچسپی کا باعث ہے- اور اسکے تنوع کا آئینہ دار-

شاہ بھٹائی کی شاعری اس وسیع تر دنیا کیلئے جو پاکستان کے ساتھ رونما ہوئی ہے خاص اہمیت رکھتی ہے- اب تک ہماری دنیائے فکر اور شعری روایات ایک خاص دائرہ میں محدود رہی ہیں- جس سے رسمیت کا پیدا ہونا ناگزیر تھا- آج بھی ہم خطرناک حد تک اسی کے بندھنوں میں اسیر ہیں- شاہ بھٹائی کی شاعری جو ایک آزاد آہنگ- آزاد وضع اور تندرست تصور پر مبنی ہے- ہمیں اپنے فکر و بیان میں تازگی اور وسعت پیدا کرنے کا ایک عمدہ موقع مہیا کرتی ہے- جس سے فائدہ اٹھانا ہمارے ذوق اور وسعت نظر پر موقوف ہے-

عظیم شاعری کیا ہے اور اسکے لوازمات کیا ہیں؟ اس کا جواب خواہ کچھ بھی دیا جائے لیکن شاہ عبداللطیف کے لب و لہجہ سے ظاہر ہے کہ ان کی آواز ایک بڑے شاعر کی آواز ہے- اور وہ شاعری کا ایک بڑا مظہر ہیں- جنم بھومی کے اعتبار سے ہم انھیں سندھ ہی کا چشم و چراغ کہیں گے لیکن درحقیقت وہ ایک آفاقی شاعر ہیں-

L (IV) 643—8

سرود سيع

بسم الله الرحمن الرحيم

بيت وڏي تي واءِ ڪري ڪُنل ڪُوڪار

هُن پنّ پاهِجا سارِيا هوءِ فتح هڏن لئي هاري

بيت جا سا مالي سيسي توئين و رنجو ڪر

لائي لنڪ لطيف چي تي پيڪار ياني بو تويده

بوي ورا ڪيا هوت حضور بيت ڪوجو

وڏي وڏجن ورِ وڏنا ءِ وڏس ڏڪ ڏيڪي

ڏ ڏجن ڏِني سي ڏڪيا تيا بيت ڏي سڏي ڏنڪ

مزار پر رکھا ہوا قلمی نسخہ موسوم بہ "گنج"

ديسي ١

ڀنڀنڀي هن ڀنڀور مين وهن وِهه نيمون

متيون موتن سنديون ڪاڪيون ڪي ته دنوه

سرتيون ساهه سندوم تيهنو حوالي هوت جي

١

ڏاجن تي ڏاجا ڏنائون ڏکهي ڪهي

لکس ناوُد نينهه جي تلب اندر ڪا جا

تهرن مين تها جا ڪري منڌهه مون سان

١

ڪو منهه ڪتهل آئيو هي وس نه ويچاري

هوت تنهن جي هتهه ري پهچي نه پاري

اچين جي آري نه پاند بُهي لڪ لکيهان

٧

ڪو منهه ڪتهل آئيو ناهه ويچاري وس

هوت تنهن جي هتهه ري ڪولي تهمي نه ڪس

ڏکهه ڏکهي جو ڏِس نه مورهي ڪو منهه نيمي

مشہور جرمنی ڈاکٹر ٹرمپ کے
مرتب شدہ نسخے کا ایک ورق

شاہ عبداللطیف بھٹائی ۱۷۵۲ع میں فوت ہوئے تھے۔ اس حساب سے سال رواں میں ان کی وفات کو پورے دوسو دو سال ہوتے ہیں۔ اس عرصے میں ان کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تحقیق و جستجو پایۂ تکمیل کو پہونچ چکی ہے۔ کسی مسئلے کی تحقیق کے عموماً دو پہلو ہوتے ہیں۔ اول اسکے متعلق تمام تحقیقی و معلوماتی مواد جمع کرنا۔ دوم اس مواد سے صحیح نتائج کا استنباط اور اس کے ساتھ حیات انسانی اور اس لے مختلف پہلووں کا ربط قائم کرنا۔ پہلی شق کے سلسلے میں ضروری ہے کہ شاہ عبداللطیف کے حالات زندگی کو ترتیب دیا جائے اور ان کے مجموعہ کلام کو مرتب کر کے اس کی شرح کی جائے۔ دوسری شق کا تعلق ان کے کلام کو سمجھنے اور زندگی کے مختلف پہلوون کے ساتھ اس کا ربط قائم کر نے سے ہے۔

پہلے موضوع پر اس وقت تک کافی روشنی ڈالی جاچکی ہے۔ میر شیر علی قانع (۱۷۶۷ع) نظر علی بلوچ مصنف "مرغوب احباب" (۱۸۴۵ع) مسٹر رچرڈ برٹن (۱۸۷۱-۱۸۵۱ع) باٹل فریڈ (۵۹-۱۸۵۶ع) دیا رام گدو مل سگما" (۱۸۸۲ع) میر عبدالحسین خاں سانگی مصنف "لطائف لطیفی" متوفی ۱۹۲۴ع۔ مرزا قلیچ بیگ مصنف "احوال شاہ عبداللطیف بھٹائی" (۱۸۸۷ع) لیلا رام وطن مل (۱۸۹۹ع) ڈاکٹر گربخشانی (۳۳-۱۹۲۳ع) ڈاکٹر سورلے (۱۹۴۰ع) مولوی دین محمد وفائی مرحوم (۱۹۵۰ع) بھیرو مل لال چند جیٹھم مل- ایم- ایم- گڈوانی- مسٹر پمنانی- محمد صدیق میمن اور لطف اللہ بدوی کی گرانقدر تصانیف میں شاہ بھٹائی کے متعلق کافی معلومات ملتی ہیں- علاوہ ازیں العلماء ڈاکٹر داود پوتا- جناب عثمان علی خان صاحب اور کئی دیگر حضرات نے مختلف مضامین میں شاہ بھٹائی پر بہت کچھ لکھا ہے۔

دوسرا پہلو ابھی تک تشنہ ہے۔ شاہ صاحب کے کلام کے صرف متصوفانہ پہلو پر نگاہ ڈالی گئی ہے اور ان کے پیغام اور نظریہ حیات کا بسیط مطالعہ نہیں کیا گیا۔ اس کے لئے بنیادی پس منظر کو واضح کرنے کی اشد ضرورت ہے جو شاہ بھٹائی کے ماحول- سوانح اور کلام کی بنیادی تحقیق پر موقوف ہے۔ یہ تحقیق اسی صورت میں صحیح ہوسکتی ہے جب یہ جلد از جلد مکمل کر لی جائے۔ کیونکہ شاہ بھٹائی کی وفات سے لے کر اب تک دو سو دو سال کے عرصہ میں کتنے ہی حقائق ناپید ہوگئے ہیں۔ دوسرے جو موجودہ نسل

آنے والی نسلوں سے پھر بھی شاہ بھٹائی کے زمانے سے زیادہ قریب ہے۔ موجودہ سندھ اس وقت بھی ایک حد تک وہی سندھ ہے جو شاہ بھٹائی کے زمانے میں تھا۔ "ماروئڑن" کا ماحول بھی ابھی تک وہی ہے۔ ابھی تک اس ماحول میں کچھ زیادہ سماجی اور معاشی تبدیلیاں نہیں ہو ئیں۔ نیز ابھی تک شاہ بھٹائی کے مریدوں اور صحبت یافتہ سالکوں کے مریدوں کے مرید سندھ میں موجود ہیں اور ان کے کلام کے "سالک" ابھی تک سندھ کے دور دراز گاؤں میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان سے شاہ بھٹائی کی زندگی کے حالات۔ ان کا نایاب کلام اور اس کی مختلف روایتیں مل سکتی ہیں۔ بنیادی تحقیق کے یہ سر چشمے ہر نئے محقق کی پیاس بجھا سکتے ہیں اور ان کی تحقیق آنے والی نسلوں کے لئے بنیادی تحقیق ہوگی جس کی بنا پر صحیح نظریئے قائم کئے جاسکیں گے۔
آئیے ہم ان امور پر نظر ڈالیں جن کے بارے میں ابھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

۱۔ شاہ بھٹائی سے پہلے کا ماحول تشنہ تحقیق ہے۔ اس وقت کے سیاسی و اقتصادی حالات پر ڈاکٹر سورلے نے اپنی کتاب "شاہ عبداللطیف آف بھٹ" میں خوب روشنی ڈالی ہے لیکن ادبی ماحول واضح نہیں ہوا۔ ڈاکٹر داود پوتا کا "میاں عیسیٰ" کے متعلق تازہ مضمون اس تحقیق کی اہمیت ظاہر کرتا ہے۔

۲۔ شاہ بھٹائی کے سوانح حیات پر ابھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ مثلاً (الف) شاہ بھٹائی کی ابتدائی زندگی کے متعلق ہماری معلومات ناکافی ہیں۔ ہمیں معلوم کرنا ہے کہ وہ ان پڑھ تھے یا پڑھے لکھے۔ (ب) ان کے خاندان یعنی متعلوی (مٹیاروی) سادات کے شجرہ نسب اور شاہ بھٹائی کے خاص قبیلے پر ابھی تک روشنی نہیں ڈالی گئی۔ ابھی ابھی سید غلام مرتضیٰ شاہ سنائی نے اپنی تصنیف "پیغام لطیف" (قلمی نسخے) میں اس پہلو پر تفصیلی بحث کی ہے۔ (ج) شاہ بھٹائی کی سیر و سیاحت کے متعلق ہماری معلومات بالکل سطحی ہیں۔ اگرچہ مسٹر بھیرو مل نے ایک کتابچہ لکھکر اس سلسلے میں بہت اچھی ابتدا کی ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ شاہ بھٹائی نے اپنے کلام میں جن مقامات۔ علاقوں اور شہروں کا ذکر کیا ہے۔ وہ ضرور وہاں گئے ہوں گے۔ لیکن یہ مفروضہ غیر محققانہ ہے۔ کیونکہ شاہ بھٹائی نے اپنے کلام "سر سارنگ" میں کتنے ہی شہروں اور ملکوں کے نام لئے ہیں۔ لیکن گمان غالب ہے کہ وہ وہاں کبھی نہیں گئے۔ دوسری طرف روہڑی۔ سکھر اور ٹھٹھہ میں شاہ بھٹائی کے تکئے موجود ہیں جو ان کے وہاں جانے اور رہنے کی دلیل ہیں۔ لیکن ان کے کلام میں سکھر۔ روہڑی اور ٹھٹھہ کا کوئی ذکر نہیں۔ شاہ بھٹائی کی سیر و سیاحت کے بارے میں تحقیق کے لئے ضروری ہے کہ انسان خود سیر کرکے شاہ بھٹائی کی گذر گاہوں۔ منزلوں اور تکیوں کا پتہ لگائے۔ اور ایک نقشہ تیار کرکے بتائے کہ اس سلسلہ میں کون کونسی انوکھی باتیں معلوم ہوسکتی ہیں۔

شاہ صاحب کے متعلق بہت سے قصے مشہور ہیں۔ ایک قصہ سے پتہ چلتا ہے کہ غالباً وہ شاہ بندر ڈویژن (قدیم ککرالہ) میں گئے تھے۔ وہاں کے مقامی لوگوں سے معلوم ہوا ہے کہ "لاڈیون" نامی قصبہ سے تقریباً دس میل جنوب کی طرف "ڈیرے" نامی ایک اجڑی ہوئی بستی ہے جس کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں۔ یہ بستی شاہ بھٹائی کے زمانہ میں "کیہر قوم" کی طاقت کا مرکز تھی۔ یہاں کا حکمران بڑا سرکش اور ظالم تھا۔ اگر

بیچارے شتر بانوں کے اونٹ اس کے علاقے میں آ نکلتے تو وہ ان کی ٹانگوں اور دموں میں آگ کے گولے بندھوا دیتا تھا۔ تاکہ وہ جل کر بلبلا اٹھیں۔ ایک دفعہ شاہ بھٹائی ان شتر بانوں کے خیموں میں مقیم تھے۔ وہاں کچھ اونٹ چیختے چلاتے آئے۔ شاہ بھٹائی نے اس کی وجہ دریافت کی۔ شتر بانوں نے ان کو تمام ماجرہ سنایا اور بولے۔ "حضور! یہ بے زبان جانور آپ کے پاس فریاد لے کر آئے ہیں"۔ یہ سن کر شاہ بھٹائی کو جانوروں کی حالت زار پر بڑا رحم آیا اور انہوں نے فی البدیہہ ایک شعر پڑھا جس کا مفہوم یہ ہے:۔

"غارت ہوں یہ محلات۔ شتر بانوں کے خیمے آباد رہیں۔ میں اونٹنیوں کے دودھ کو بھول نہیں سکتا۔ شتر بان ہمیشہ آباد رہیں اور ان کو ستانے والے دودھ سے محروم رہیں"۔ پھر ان بیچارے شتر بانوں کو مخاطب کرکے کہا:۔

"بیٹو! جہاں اب کیہر قوم کے ڈیرے یعنی محل ہیں۔ وہاں اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ بنے گی"۔

کہتے ہیں کہ اس کے بعد بہت ہی جلد "کیہروں" کا یہ قصبہ مٹ کر کھنڈر بن گیا۔ ممکن ہے یہ کہانی صحیح نہ ہو۔ لیکن وہاں کے باشندوں میں اس کی شہرت ہی شاہ بھٹائی کے وہاں جانے پر شاہد ہے۔

"تذکرہ مخادیم کھڑا" سندھ کے مشہور قصبہ کھڑا کے مخدوموں کا لکھا ہوا مستند و معتبر ریکارڈ ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ شاہ بھٹائی ایک دفعہ قصبہ کھڑا کے باہر آکر مقیم ہوئے۔ انہوں نے حسب معمول سازوں پر محفل سماع شروع کرائی۔ کھڑوں کے مخدوم بڑے متشرع تھے اور غیر شرعی کام سے باز رکھنے اور غیر شرعی کام کرنے والوں کو سزائیں دینے میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ اس زمانہ میں مخدوم میاں محمدی (احمدی؟) اپنے وقت کے بڑے عالم تھے۔ جب انہیں بتایا گیا کہ بھٹ کا ایک بزرگ آیا ہے اور مزامیر کے ساتھ محفل سماع کرا رہا ہے تو انہوں نے شاہ بھٹائی کے بلانے کو ایک آدمی بھیجا۔ شاہ نے اس عالم دین کے حکم کو بسر و چشم تسلیم کیا۔ لیکن زیادہ رات گزر جانے کے سبب صبح تک مہلت مانگی اور مشہور ہے کہ شاہ بھٹائی نے ایک ٹھیکری پر کوئلہ سے یہ بیت لکھکر مخدوم کو بھجوا دیا:۔

(ترجمہ) "اس وقت تو نہ آونگا۔ صبح کے وقت آونگا۔ اے دوست! تم اس ذات (یعنی حضرت محمد صلعم) کے ہم نام ہو۔ جو کمزوروں کا بوجھ اٹھانے والے تھے"۔

غرض یہ قصہ بڑا طویل ہے اس کی مزید تائید شاہ کے دراز جانے اور سچل سر مست کو بچپن میں دیکھنے والی مشہور روایت سے ہوتی ہے۔

شاہ بھٹائی کے فقیروں کے متعلق ابھی تحقیق نہیں ہوئی۔ ہمیں ابھی تک صرف تماچی فقیر۔ تمر فقیر۔ راول فقیر اور صالح فقیر کے کچھ حالات معلوم ہوئے ہیں۔ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ تمر فقیر نے اپنے ساتھی تماچی فقیر سے کہا "بھائی آپ بڑے فقیر ہیں اور مشکل مسائل آپ ہی سمجھاتے ہیں۔ لیکن آپ کے بعد ہم مشکل مسائل کس سے

دریافت کریں گے اور روحانی راز ہمیں کون سمجھائے گا؟" تماچی فقیر بولے۔ "مخلص دوستوں اور ساتھیوں کا تعلق روحانی ہے۔ وہ تو ہر حالت میں قائم رہیگا۔ اگر میں نے پہلے انتقال کیا اور آپ کو جو کچھ دریافت کرنا ہو تو میری قبر پر آکر پوچھو۔ میں اس کا جواب دونگا"۔

اتفاقاً تماچی فقیر پہلے فوت ہوگیا اور تمر فقیر ایک دفعہ محویت کے عالم میں تماچی فقیر کے مزار پر پہنچا اور حسب ذیل مفہوم کا ایک بیت پڑھا۔

"میرے بلانے سے آج دوست بھی جواب نہیں دیتے اور نہ ان کی سواریاں ہی کچھ آواز نکالتی ہیں۔ ایسے حادثے اس شہر خاموش میں ہوتے ہیں"۔

تمر فقیر یہ بیت پڑھ کر خاموش ہوا ہی تھا کہ اسے ایسا معلوم ہوا گویا اس کے کانوں پہ صدا گونجی۔

"عشق و محبت میں اپنا ساز و سامان قربان کرکے جد و جہد کے راستہ پر کمر بستہ ہوجا اور حسب و نسب کے تفرقات کو ترک کرکے بلوچ (آنحضرت) کا تابع ہوجا"۔

راول فقیر بھی شاہ بھٹائی کا بڑا معتقد تھا۔ ایک دفعہ شاہ صاحب نے اپنے فقیروں کو ہدایت کی کہ وہ ہر قسم کی منشی چیزوں سے پرہیز کریں۔ دوسرے فقیروں نے تو منشیات چھوڑ دئے مگر راول فقیر جو حقہ کے عادی تھے۔ فوراً حقہ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ وہ کسی گوشہ میں چھپ چھپاکر حقہ پی لیتے تھے۔ ایک دفعہ شاہ بھٹائی نے انہیں حقہ پیتے ہوئے دیکھ لیا تو انہیں مخاطب کرکے ایک بیت پڑھا۔

(ترجمہ) گڑگڑاہٹ کئے جارہے ہو اور تم پر تل کے برابر بھی ہدایت کا اثر نہیں ہوا۔ سالک کے لئے مرشد کے حکم کی تعمیل نہ کرنا بہت برا ہے۔ تمہارا جینا بے سود ہے۔

اس طنز کا نتیجہ یہ ہوا کہ راول فقیر پر بیہوشی طاری ہوگئی اور وہ اسی حالت میں فوت ہوگیا۔ شاہ بھٹائی کو اپنے اس معتقد کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا۔ جب جنازہ اٹھا تو انہوں نے ایک وائی کہی۔

(ترجمہ) "اے میرے بھائی راول! رات کیوں نہ رہے؟ اے راول رات کیوں نہ رہے؟"

ان فقیروں سے متعلق قصے نہ صرف ادبی اہمیت رکھتے ہیں بلکہ بھٹائی کی شخصیت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ دوسرے کون بڑے فقیر تھے جن کو شاہ بھٹائی کی صحبت اور رفاقت کا شرف حاصل تھا۔

مذکورہ بالا چار فقیر کون تھے۔ وہ کہاں سے آئے۔ ان کا کلام کتنا ہے اور کیسے جمع ہوسکتا ہے؟ چند اور سوال ہیں۔

۴۔ شاہ بھٹائی کے معاصر شعراء۔ صوفیہ اور مشہور شخصیتیں کون تھیں جن سے ان کی ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر گربخشانی اور نظر علی بلوچ نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس کام کا سنگ بنیاد ہے۔ مولوی دین محمد وفائی نے بعض قلمی نسخوں

میں سے کچھ معلومات اپنی کتاب "لطف اللطیف" میں نقل کی ہیں۔ چند دن ہوئے مجھے گوٹھ پیر جھنڈے کے کتب خانہ سے فارسی کا ایک چھوٹا سا رسالہ الموسوم بہ "رسالہ اویسیہ" ملا۔ جس میں شاہ بھٹائی کی طرف سے مخدوم محمد معین ٹھٹھوی کے لکھے ہوئے خط اور اس کا جواب تحریر ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ابھی سندھ میں اس قسم کا بہت سا قلمی مواد موجود ہے۔ شاہ صاحب اور ان کے ہمعصر شاہ عنایت رضوی کے تعلقات پر بھی مزید روشنی ڈالنی کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں میرے قلم سے "نئیں زندگی" میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس سے اس تحقیق کا تھوڑا بہت آغاز ہوا۔ عنایت شہید ایک اور صوفی بزرگ تھے۔ یہ ناممکن ہے کہ بھٹائی جیسے سیلانی بزرگ کی ان سے ملاقات نہ ہوئی ہو۔ مختلف روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ بھٹائی نے ان کی شہادت پر چند فی البدیہہ اشعار کہے۔

۵۔ شاہ بھٹائی کی موسیقی کے متعلق کافی تحقیق نہیں ہوئی یعنی "رسالو" کے سروں کی وجہ تسمیہ اور ان کی اصلی کیفیت وغیرہ کے بارے میں چھان بین نہیں کی گئی۔ جن دھنوں میں بھٹ کے فقیر شاہ کا کلام گاتے ہیں۔ ان کا سمجھنا اور مضامین کی کیفیت اور بناوٹ پر غور کرنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر گربخشانی نے سروں کی جو تشریح کی ہے اور الحاج اللہ بخش عقیلی کا مضمون "شاہ بھٹائی اور ان کی موسیقی" اس سلسلے کے اب تک اول قدم ہیں۔

۶۔ ان فقیروں کے متعلق جو شاہ بھٹائی کی محفل سماع میں گاتے تھے۔ ہنوز کوئی معلومات نہیں۔ ان کے علاوہ مزار کے کلید بردار فقیروں کے متعلق تفصیلی حالات اور ان کے کلام کے متعلق معلومات بہم پہونچنے سے بہت کچھ مواد فراہم ہونے کا امکان ہے۔

۷۔ شاہ بھٹائی کے بعد ان کے جو طالب اور معتقد ہو گزرے ہیں۔ وہ صوفی ہوں یا شاعر ان کے حالات زندگی اور کلام کی تحقیق اور تحریر و ترتیب اس سلسلے کی مفید کڑیاں ہیں۔

شاہ بھٹائی کے کلام سے متعلق تحقیق کے دو خاص پہلو ہیں۔ اول ان کا اصلی کلام تمام ذریعوں سے جمع کرکے ایک صحیح مستند دیوان ترتیب دینا۔ دوم۔ ان کے کلام کی جامع تشریح۔

شاہ بھٹائی کے رسالو کو سب سے پہلے شائع کرنے کا سہرا ایک جرمن مشرق ڈاکٹر ٹرمپ کے سر ہے۔ اس کے بعد بمبئی سے دو ایڈیشن شائع ہوئے جن میں سے ایک کو محمد صدیق میمن نے حیدرآباد سندھ سے دوبارہ شائع کیا۔ حکومت سندھ کا ایڈیشن اور مرزا قلیچ بیگ۔ ڈاکٹر گربخشانی۔ غلام محمد شہوانی۔ محمد عثمان ڈیپلائی اور مولوی غلام مصطفیٰ کے مرتبہ چند اور اڈیشن بھی ہیں جو سندھی عوام کی علمی پیاس بجھا رہے ہیں۔ ڈاکٹر گربخشانی نے جس محققانہ کد و کاوش سے اپنا ایڈیشن مرتب کیا ہے اس کے باوجود ایک مستند رسالے کی اشد ضرورت ہے۔ چنانچہ حکومت سندھ کے سندھی بورڈ نے یہ کام ڈاکٹر دائود پوتا کے سپرد کیا ہے۔ اس سلسلے میں اہل تحقیق کے لئے مطبوعہ نسخوں کے علاوہ اور بھی کافی مواد موجود ہے۔ (الف) بلڑی۔ بھٹ۔ برٹش میوزیم اور سانگی کے قلمی نسخے اور بمبئی اور پزگ کے مطبوعہ ایڈیشن اور دیگر قلمی نسخے جو

سندھ میں موجود ہیں- ان میں سے چند ڈاکٹر دائود پوتا اور عثمان انصاری کے پاس ہیں- مزید جستجو سے سندھ میں اور بھی مفید نسخے دستیاب ہو سکتے ہیں- ایک ایسا نادر قلمی نسخہ بھٹ میں موجود ہے جسے "گنج" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے- اس سے بہت کچھ نیا کلام مل سکے گا- (ب) سندھی سگھڑوں کا صدری خزانہ- (ج) بہت ممکن ہے کہ بعض مقامی فقیروں یا باہر سے آنے والے سالکوں نے نئے وائیاں اس وقت یاد کر لی ہوں جو شاہ کے جمع شدہ کلام میں درج نہیں اور ان فقیروں اور سالکوں کے پاس آنے والے سگھڑوں (دہقانی شاعروں) اور سالکوں کے پاس یہ کلام سینہ بسینہ چلا آرہا ہو- ان سگھڑوں کی محفلوں میں شاہ بھٹائی کا بہت سا کلام ملتا ہے جو شاہ کے مطبوعہ رسالو میں نہیں- ہو سکتا ہے کہ اس کا بہت سا حصہ شاہ کے بجائے دوسروں کا کلام ہو اور شاہ کے نام منسوب کر دیا گیا ہو- ضرورت ہے کہ شاہ کے اپنے اور الحاقی کلام کو جمع کر کے پرکھا جائے اور مستند کلام کو الگ کرلیا جائے-

اگرچہ مرزا قلیچ بیگ- محمد بخش واصف- ڈاکٹر گربخشانی- بھیرو مل اور دوسرے ادیبوں نے شاہ بھٹائی کے کلام- ان کے انوکھے الفاظ- اصطلاحوں اور سروں وغیرہ کی شرح کی ہے- پھر بھی اس سلسلے میں بہت کچھ تحقیق کی ضرورت ہے- ابھی تک شاہ بھٹائی کے بہت سے ابیات- تلمیحیں اور اشارے تشریح طلب ہیں- فصاحت و بلاغت اور بدیع و معانی کے لحاظ سے بھی شاہ بھٹائی کے کلام پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے- شاہ صاحب نے محض شاعری یا قصہ طرازی ہی کے لئے شعر نہیں کہے انہوں نے اپنے پیش روئوں کی طرح صوفیانہ شاعری کے ذریعے اپنے خیالات ظاہر کئے- لیکن یہ جاننا ضروری ہے کہ تصوف محض نقطہ نظر یا ذریعہ ہے- مقصود بالذات نہیں- اب شاہ کے کلام کا ایک اور انداز سے مطالعہ کرنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ ہم اس سے حیات انسانی کو سمجھنے میں مدد لیں یعنی اب ہمیں اس کا رخ بدلنے کی ضرورت ہے- اس سلسلہ میں جو سوالات پیدا ہوتے ہیں اور جنہیں شاہ بھٹائی نے سلجھانے کی کوشش کی ہے ان کی کیفیت حسب ذیل ہے-

بنی نوع انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اس کے حصول کے لئے انسان کو انفرادی و اجتماعی طور پر کیسی ترتیب کی ضرورت ہے؟ شاہ بھٹائی کس قسم کے اخلاق کے علمبردار اور کس قسم کے معاشرے کی ترویج کے خواہاں تھے؟ وہ معاشرے کی کن خرابیوں کے شاکی تھے اور کن خوبیوں کے آرزو مند؟ نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے انہوں نے انسانی جذبات و احساسات کی کسطرح عکاسی کی ہے؟ ان کی نگاہ میں دکھ درد اور مسرت و انبساط کی ماہیت کیا ہے؟ ان کے کلام میں حسن اور ذوق جمال کی کیسی جھلک نظر آتی ہے؟ ان تمام مسائل کا حل اور حقائق کا انکشاف آئندہ کی تحقیق کی بنیاد ہے- مستقبل کے محققوں اور مفکروں کے لئے شاہ بھٹائی کے کلام میں اگر کوئی نتیجہ خیز تحقیق کا میدان ہے تو ان کے اپنے الفاظ میں یہ کہ:-

"اے پڑھنے والے جس کو تو معمولی اشعار سمجھا ہے وہ آیات ربانی ہیں- ان کے مطالعہ سے انسانی قلوب اپنے حقیقی محبوب یعنی خالق کی طرف رجوع ہوتے ہیں"-

(ماہ نو کے شکریہ کے ساتھ)

سندھ کے صوفی شاعر

اللہ بخش عقیلی

L (۱۷) 643—9
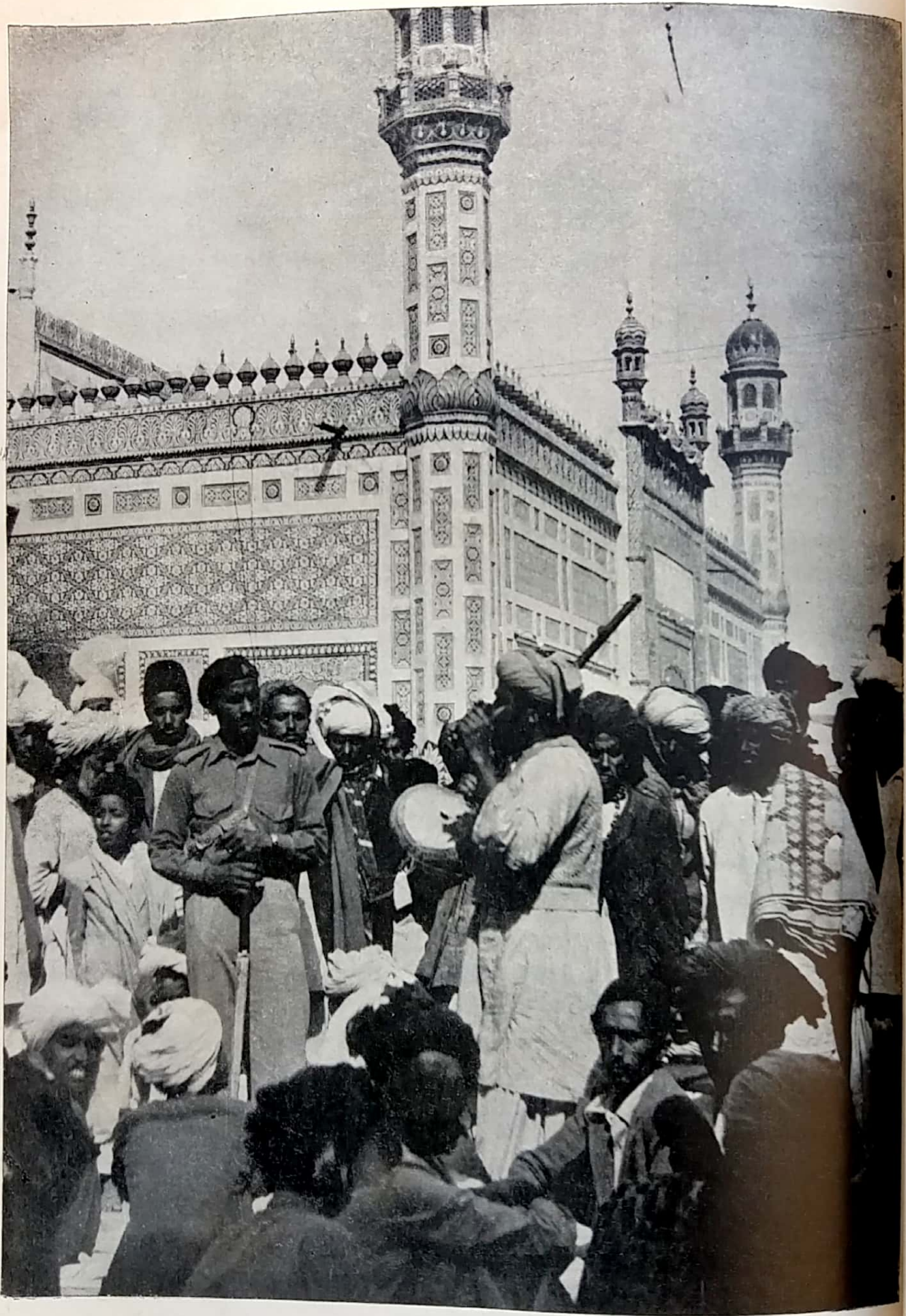
فقیر گل محمد روضہ کے صحن میں شاہ کا کلام یکتارے پر گا رہے ہیں

شاہ عبداللطیف بھٹائی- سید عبدالکریم کے پر پوتے اور سید حبیب کے فرزند تھے- اسی نسبت سے تصوف اور شاعری کا شغف انھیں ورثے میں ملا تھا- لیکن ان کی اپنی زندگی کے واقعات نے اسی شغف کو اور بھی ابھارا- یہ سنہ ۱۱۰۲ھ میں ہالہ پرگنہ کے ایک گاوں میں پیدا ہوئے- جو اب ویران ہے- شاہ عبداللطیف کی والدہ بھی ایک عالم اور درویش مخدوم عربی دیانہ مجذوب ہالائی کی دختر تھیں- جوانی کے زمانے میں شاہ لطیف کو گاوں کے ایک ترک امیر مرزا مغل بیگ کی دختر سے انس ہوگیا- لیکن اس ترک امیر نے اپنی بیٹی کو ایک فقیرانہ گھر میں دینا گوارا نہ کیا-

مجازی عشق کی یہ چوٹ شاہ صاحب کے حق میں رحمت ثابت ہوئی- اور وہ بے چینی کی حالت میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے- راہ میں جوگی سنیاسیوں کی ایک ٹولی مل گئی- دنیا سے دل برداشتہ پہلے ہی تھے- اس تارک الدنیا گروہ کا ساتھ انہیں پسند آ گیا- اس لئے ان کے ساتھ ہولئے- یہ جوگیوں کا گروہ بدھ دھرم کے پرانے آستانوں کا چکر کاٹا کرتا تھا- شاہ صاحب بھی تین برس تک ان کے ساتھ پھرتے رہے- اس دوران میں کچھ کاٹھیاواڑ- لکھ پت- گرتار- جیسلمیر اور پھر بلوچستان کے بدھ زمانے کے آستانے لاہوت لامکان- منگلاج وغیرہ دیکھتے ہوئے کابل تک پہونچ گئے- وہاں سے پھر لوٹ کر براہ قندھار منگلاج آئے- سنیاسیوں نے اتنا زمانہ ان کو ساتھ پھرانے کے بعد منگلاج کی واپسی پر اس بات پر مجبور کرنا چاہا کہ وہ بھی ان کی طرح چند مشرکانہ رسوم بجا لائیں- شاہ صاحب نے یہ گوارا نہ کیا- اور بیزار ہوکر سنیاسیوں کا ساتھ چھوڑ دیا- اس پریشانی کے عالم میں وہ سندھ کے پایہ تخت ٹھٹھہ میں پہونچے- یہاں ان کی صحبت ملا معین ٹھٹھوی سے ہوگئی- جو عالم اور محدث ہونے کے علاوہ- صوفی- فلسفی اور شاعر بھی تھے- ملا معین دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت میں بھی رہے- ان کی شاگردی کا شرف بھی حاصل کرچکے تھے- تصوف. موسیقی اور شاعری سے

انہیں خاص شغف تھا۔ فارسی کلام میں تسلیم اور ہندی اور سندھی شاعری میں بیراگی تخلص رکھتے تھے۔ اس وقت شاہ صاحب کی عمر تقریباً تئیس برس کی تھی۔ ملا معین کی صحبت نے شاہ صاحب کو بہت متاثر کیا اور یہیں سے انہیں تصوف۔ موسیقی اور شاعری سے وہ شغف پیدا ہوا جو بعد کو ان کی زندگی کا جزو بن گیا۔ وطن آنے کے بعد ان کی شادی مغل بیگ کی اسی لڑکی سے ہوئی جسے وہ چاہتے تھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں عقیدتمندوں کا ایک گروہ ان کے گرد جمع ہوگیا۔

شاہ صاحب نے ایک ریت کے ٹیلے پر اپنا الگ گاوں بسالیا۔ جو بھٹ شاہ کہلاتا ہے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ۲۶ برس کی تھی۔ اس کے بعد ان کی عمر کے آخری چالیس برس متواتر شعر کہنے اور حال اور قال کی محفلوں میں گذرے۔ اس دوران میں آپ جو بھی شعر کہتے آپ کے ایک ساتھی ان کو قلم بند کرلیتے۔

شاہ صاحب کے کلام کی ترکیب قدیم ہندی "دوہہ" یعنی دو بیتی کے طرز پر ہے۔ پھر اس میں کچھ اضافہ کرکے شاہ صاحب نے موسیقی کے انداز پر وہ چیز ایجاد کی جو سندھی کافی کہلائی یہ سنگیت کے تسلیم شدہ اصولوں کے مطابق کسی خاص راگ یا راگنی میں گائی جاتی ہے۔ شاہ صاحب کے کلام کا مجموعہ "شاہ جو رسالو" یعنی شاہ کا رسالہ کہلاتا ہے۔ آپ کا تخلص لطیف اور بعض جگہ سید ہے۔ شاہ صاحب کے کلام کے مقبول ہونے کے چند وجوہات یہ ہیں:۔

۱۔ شاہ صاحب سے پہلے کا سندھی کلام منتشر حالت میں تھا۔ ان کا کلام پہلی دفعہ باقاعدہ رسالے کی صورت میں جمع ہوا۔

۲۔ سندھی کلام کی موسیقانہ ترتیب خود شاہ صاحب کی رہین منت ہے۔ ان کا کلام پہلی مرتبہ مستقل راگ کی صورت میں پیش ہوا۔ اور اس لئے عام زبانوں پر چڑھکر مقبول ہوگیا۔ اور خود عوام کی زبان اس کی محافظ بن گئی۔

۳۔ شاہ صاحب نے اپنے ہی زمانے کی سندھی زبان اختیار کی۔ تاکہ عام لوگ ان کے مفہوم کو سمجھ سکیں۔ اسی باعث سندھی زبان کی لغت کے سینکڑوں الفاظ جو اس دور میں رائج تھے اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہوگئے۔

۴۔ صوفیانہ مذاق سندھ میں پہلے سے موجود تھا اور عوام فطرتاً اس کی طرف مائل تھے۔ اس مذاق کو شاہ صاحب کے کلام نے تقویت بخشی اور عوام کے قلوب اس سے تسکین حاصل کرنے لگے۔ تصوف کے اکثر دقیق مسئلے آپ نے عام فہم انداز میں تشبیہ اور استعارے کے ذریعے ذہن نشین کرائے۔

۵۔ عشقیہ مضامین کے ادا کرنے کیلئے شاہ صاحب نے سندھ کے وہی قدیم رومانی افسانے منتخب کئے جن سے عوام پہلے ہی سے واقف تھے۔ شاعری اور موسیقی نے ان افسانوں میں دلکشی اور جاذبیت پیدا کردی۔

ان افسانوں میں بھی شاہ صاحب نے اس بات کا خیال رکھا کہ کوئی افسانہ مکمل نہ ہونے پائے تاکہ بار خاطر نہ ہو۔ بلکہ ان افسانوں سے چیدہ چیدہ واقعات چن کر ان کو مثالی طور پر بیان کیا۔ اور ان سے عشق الٰہی کے نکتے سمجھائے اور تصوف کے مسئلے حل کئے۔

۶۔ شاہ صاحب کے کلام میں فن شعر کی جملہ خوبیاں موجود ہیں۔

۷۔ راگ راگنیاں جو شاہ صاحب نے منتخب کیں ان میں سندھی ماحول اور سندھی زبان کے تلفظ کو ملحوظ خاطر رکھا۔ اور ساتھ ہی راگ کو سندھ میں مستعمل سازوں کے ساتھ ایسا ہم آہنگ کردیا کہ سندھی گائیکی کی ایک ممتاز اور نمایاں صورت قائم ہوگئی۔ سندھ میں اک تارہ۔ تانپورہ اور تار کے ساز تھے اور طبلہ کی جگہ مٹی کا دلہ استعمال ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ شاہ صاحب نے سندھی گائیکی کو بھی وہ شکل بخشی جو عام فہم تھی۔ اور اس کے لئے پیشہ ور گویوں اور فنی مہارت رکھنے والوں کی احتیاج نہ رہی۔

صوتی نوا سنجی کی تھوڑی سی مہارت رکھنے والا ان کو آسانی سے گانے لگ جاتا تھا۔

سندھ کی موسیقی اور شاعری میں شاہ عبداللطیف کا وہی درجہ ہے جو اردو شاعری میں حضرت امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ کو حاصل ہے۔

(ریڈیو پاکستان کے شکریہ کے ساتھ)

شاہ بھٹائیؒ

عبدالواحد سندھی

بھٹ شاہ کے میلے کا ایک منظر

سندھ کے زندہ جاوید شاعر شاہ لطیف بھٹائی۔ سندھ کے مشہور متعلوی سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد بزرگوار کا نام سید حبیب تھا اور ان کے پردادا سندھ کے مشہور صوفی۔ ولی کامل اور شاعر۔ شاہ عبدالکریم "بلڑی والے" کہلاتے تھے۔ انہیں سندھی زبان میں متصوفانہ شاعری کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی آج سے تقریباً ڈھائی سو سال قبل سنہ ۱۶۸۹ء میں سندھ کے مشہور حکمراں خاندان کلہوڑہ کے عہد حکومت میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی جائے پیدائش۔ بھٹائی پور ہے جو حیدرآباد سندھ کے مشہور قصبہ "ہالا" کے قریب ایک چھوٹا سا گاوں ہے۔

عام طور پر مشہور ہے کہ عارف بھٹائی نے کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہہ نہیں کیا بلکہ جو کچھ علم حاصل کیا وہ اپنی خداداد قابلیت۔ جبلی ذہانت۔ فطانت اور تجربات دنیا کی درسگاہ میں حاصل کیا۔ وہ علوم ظاہری میں اپنے معاصرین سے کسی طرح کم نہ تھے۔ عربی۔ فارسی اور ہندی زبان پر انہیں کامل عبور حاصل تھا۔ وہ ان زبانوں کے محاورات اور ضرب المثال کو سندھی کا لباس پہنا کر کچھ اس طرح استعمال کرتے تھے کہ انہیں قادرالکلام اور صاحب زبان ماننے میں تامل نہیں ہوتا۔

شاہ بھٹائی اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنے آبائی گاوں سے نکل کر ایک اونچے "بھٹ" پر آباد ہوگئے۔ سندھی زبان میں بھٹ ریت کے اونچے ٹیلے کو کہتے ہیں۔ اس وقت سے یہ گاوں "شاہ کی بھٹ" کے نام سے مشہور ہوگیا ہے۔ یہ مقام حیدرآباد سندھ سے تقریباً ۳۵ میل شمال مشرقی جانب پاکستان کی اس مشہور شاہراہ پر واقع ہے جو کراچی اور پشاور کو آپس میں ملاتی ہے۔ پہلے یہ مقام بالکل ویران اور اجاڑ تھا۔ یہاں

ریت کے اونچے اونچے ٹیلے اور ایک چھوٹی سی جھیل تھی۔ اس جھیل کا نام "کرار" تھا۔ شروع میں شاہ بھٹائی اور ان کے متعلقین آکر آباد ہوئے ان کے بعد اور لوگ بھی آکر بس گئے۔ یہ گاوں بڑھتا رہا۔ اب یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس کی آبادی کوئی چار ہزار کے لگ بھگ ہوگی۔

شاہ بھٹائی نے سنہ ۱۷۵۲ع میں اسی مقام پر وصال فرمایا۔ اس سلسلے میں ایک روایت مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ شاہ صاحب ایک محفل سماع میں شریک تھے کہ ان پر بے خودی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ جس کا سلسلہ تین دن تک جاری رہا۔ محفل بھی بدستور منعقد رہی۔ تیسرے دن لوگوں نے دیکھا تو مراقبہ ہی کی حالت میں ان کی روح جسد عنصری سے پرواز کرچکی تھی۔ اس لئے اسی جگہ دفن کردئے گئے۔ سندہ کے مشہور فرماں روا میاں غلام شاہ کلہوڑہ نے ان کے مزار پر ایک عالیشان گنبد تعمیر کرایا۔ جو فن کے اعتبار سے بے مثل اور عرب اور مغل فن تعمیر کا ایک حسین و جمیل امتزاج ہے۔

شاہ بھٹائی کو موسیقی کا بڑا شوق تھا۔ وہ چشتیہ طریقہ کے صوفی تھے۔ آخر شب سے دن چڑھے تک محفل سماع منعقد رہتی تھی۔ موسیقی جاننے والے مشہور فقراء ان کے گرد جمع رہتے تھے۔ شاہ صاحب مراقبہ میں بیٹھ جاتے۔ فقراء مختلف سروں اور دھنوں میں ان کا کلام سناتے اور صاحب دل لوگوں کو تڑپاتے تھے۔

وہ شاعر کی حیثیت سے بہت بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ جس طرح اردو زبان میں دوہوں۔ کہہ مکرینوں اور ٹھمریوں کی ایجاد کا سہرہ امیر خسرو کے سر ہے۔ بالکل اسی طرح ان کو سندھی زبان میں "وائیوں" اور کافیوں کی ترویج کا فخر حاصل ہے۔ موجودہ سندھی شاعری انہی کے احسانات کی مرہون منت ہے۔ ان سے قبل سندھی شاعر صرف "دوہیڑے" یعنی دوہے کہتے تھے۔ انہوں نے ان کو ترقی دے کر وائیاں اور کافیاں کہنا شروع کردیں۔ اس وجہ سے ان کو سندھی شاعری کا بانی کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں سوز و گداز۔ زبان کی شیرینی اور بیان کی ندرت موجود ہے۔ چونکہ وہ صاحب دل عارف تھے اور ہمیشہ عشق الٰہی میں محو رہتے تھے اس لئے ان کی شاعری میں اثر ہے۔ پرانی مثل ہے "از دل بر خیزد بر دل ریزد"۔

ان کی شاعری کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ دہقان سے لے کر عالم تک ان کے کلام سے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق کسی نہ کسی طرح لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ دونوں کے دلوں پر ان کے کلام کا اثر نہایت گہرا ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کا موضوع سندہ کی قدیم مروجہ رنگین داستانوں کو بتایا ہے۔ جن کا یہاں کے عوام میں پہلے ہی سے رواج تھا۔ جیسے "عمر ماروی" "سسی پنہوں" اور "لیلا چنیسر" وغیرہ لیکن انہوں نے ان داستانوں کو اس طرح پیش کیا ہے۔ فنی اعتبار سے بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہوگیا ہے۔

ان کے کلام میں سچائی- خلوص اور سادگی ہے- ان کا کلام بہت صاف رواں- شستہ اور سہل الفہم ہے- ان کے پیام میں موجودہ زندگی اور حیات ابدی کے اسرار و رموز کی عقدہ کشائی پائی جاتی ہے- یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کو بقائے دوام اور قبولیت عام حاصل ہوئی ہے- ان کے ابدی نغموں نے ان کو زندہ جاوید بنادیا ہے- ان کے سینکڑوں اشعار اب سندہی زبان کے روز مرہ میں شامل ہیں- ہزاروں مصرعے ضرب الامثال کے طور پر لوگوں کی زبان پر چڑھ گئے ہیں- سندہی زبان کے جاننے والوں میں شائد ہی کوئی ایسا ہو جسے ان کے سینکڑوں شعر زبانی یاد نہ ہوں- حقیقت یہ ہے کہ سندہی زبان دان ہونے کی سب سے بڑی سند ہی یہ سمجھی جاتی ہے کہ اسے شاہ کے لاتعداد اشعار یاد ہوں-

"شاہ جو رسالو" یعنی شاہ بھٹائی کا دفتر شعر سندہی زبان جاننے والوں کے لئے اپنی ہمہ گیر اور مخصوص حکیمانہ تعلیمات کے پیش نظر مثنوی مولانا روم سے کسی طرح کم نہیں- چنانچہ شاہ اور رومی کے کلام کا مطالعہ کرنے والوں کو دونوں میں ایک ہی رنگ- ایک ہی مہک اور ایک ہی جھلک نظر آتی ہے- رومی نے اپنی حکیمانہ تعلیمات کے اظہار کے لئے فارسی زبان کو پسند کیا اور شاہ لطیف بھٹائی نے ایسے ہی پیام کے لئے سندہی زبان کو اپنا وسیلہ بنایا- دونوں پیاموں کا سرچشمہ ایک ہے اور وہ ہے ازلی اور ابدی سرچشمہ حکمت- یعنی قرآن کریم- رومی نے اپنے کلام میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:-

مثنوی مولوی معنوی ہست قرآں در زبان پہلوی

شاہ لطیف بھٹائی نے اپنے کلام کے متعلق کہا ہے:-

"اس کلام کو معمولی اشعار نہ سمجھو یہ آیات ربانی ہیں-
یہ آیات- پڑھنے والوں کو محبوب حقیقی کی طرف لے جاتے ہیں"-

اسی ولی کامل کا عرس بمقام- شاہ کی بھٹ- سال میں دو دفعہ منعقد ہوتا ہے- پہلا ۹ ذالحج کو خاص حج کے دن اور دوسرا صفر کے مہینے میں ۱۴ تاریخ کو- یہ دونوں عرس میلے کی شکل اختیار کرچکے ہیں اور تین دن جاری رہتے ہیں- کیونکہ صفر کی ۱۴ تاریخ ان کی تاریخ وصال ہے- اس لئے سندہ میں یہ میلہ بہت شاندار مانا جاتا ہے- اس میلے میں سندہ کے تمام اطراف و اکناف سے آکر تقریباً ایک لاکھ زائرین شرکت کرتے ہیں- امیر غریب- بچے- بوڑھے مرد اور عورتیں سب ہی شامل ہوتے ہیں اور شاہ کے مزار پر گلہائے عقیدت نثار کرتے ہیں- اس طرح اس عارف کامل کی یاد تازہ رہتی ہے-

میلہ کے دنوں میں تین دن کشتیاں بھی ہوتی ہیں اور سندھ کے مشہور پہلوان اپنے جسمانی کرتب دکھاتے ہیں۔ مختلف قسم کا سامان بھی بکنے کے لئے آتا ہے۔ ہوٹل اور چائے خانے کھل جاتے ہیں۔ بازار دن رات کھلے رہتے ہیں۔ مقبرہ شاہ بھٹائی کے وسیع صحن میں مختلف ٹولیاں اپنی اپنی محفل سماع برپا کرتی ہیں۔ مختلف سازوں پر مختلف سروں میں ان کا کلام پڑھا جاتا ہے۔ خاص مجلس سرود صبح کے چار بجے کے بعد ان کے مزار کے سامنے برپا ہوتی ہے۔ وہ انتہائی دلکش ہوتی ہے۔ مشہور ہے کہ شاہ صاحب کے زمانہ سے یہ محفل بلاناغہ منعقد ہوتی چلی آرہی ہے۔

اس موقعہ پر ادیب اور شاعر بھی کسی سے پیچھے نہیں رہتے۔ وہ دور دراز شہروں سے آتے اور بلا تکلف اجتماع میں شریک ہوتے ہیں۔ مشہور ادیب ہر سال بیان کی ہوئی داستان کو دوہراتے اور شاعر شاہ موصوف کی شان میں قصیدے پڑھتے ہیں۔ خصوصاً ان کی مجلس شعر خوانی عربوں کے عہد اولیں کی یاد دلاتی ہے۔ اس مشابہت کی وجہ بھی یہی ہے کہ سندھیوں کی اکثریت اپنی عرب اجداد پر فخر کرتی ہے۔

(ماہ نو کے شکریہ کے ساتھ)

فخرِ سندھ

آشکار حسین خواجہ

پاکستان کے ہر صوبے نے کوئی نہ کوئی شخصیت ایسی پیدا کی ہے جو دنیا کے بڑے سے بڑے آدمی کے برابر سر ملاکر کھڑی ہوسکتی ہے۔ پنجاب نے اقبال کو جنم دیا۔ بنگال میں نذرالاسلام ابھر کر سطح پر آیا۔ سرحد میں خوشحال خاں خٹک کی آواز گونجی۔ سندھ بھی اس دوڑ میں کسی سے پیچھے نہیں۔ وہ بھی اپنے زندہ جاوید شاعر۔ فلسفی اور صوفی شاہ عبداللطیف پر نازاں ہوسکتا ہے اور انھیں پورے فخر و مباہات کے ساتھ دنیا کی تمدنی و ثقافتی ترقی کی ایک اہم کڑی قرار دے سکتا ہے۔

شاہ عبداللطیف سنہ ۱۶۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی جائے پیدائش سندھ کا ایک چھوٹا سا قریہ بھٹی پور ہے یہ معمولی گاوں۔ جسے شاہ عبداللطیف کی نسبت سے بقائے دوام حاصل ہوگئی ہے۔ حیدر آباد کے قصبہ ہالا کے مضافات میں ہے۔ شاہ صاحب کی تولید کے وقت سندھ پر کلہوڑہ خاندان حکمران تھا۔ شاہ صاحب کا تعلق متعلوی سادات سے ہے۔ اور تصوف میں وہ سلسلہ چشتیہ میں شامل تھے۔ ان کا خاندان سندھ میں مشہور رہا ہے۔ ان کے والد کا نام سید حبیب تھا جنھیں ان کی بزرگی کی وجہ سے اطراف و جوانب کے مسلمان نہایت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ شاہ صاحب کے پردادا شاہ عبدالکریم ایک بلند پایہ صوفی تھے۔ شاعر اور ولی کامل کی حیثیت سے ان کا شہرہ دور دور تھا۔ انھیں "بلڑی والا" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ شاہ عبدالکریم سندھی زبان میں متصوفانہ شاعری کے بانی خیال کئے جاتے ہیں۔

شاہ عبداللطیف اپنے والد کی زندگی میں آبائی وطن ہی میں رہے۔ اس کے بعد انھوں نے گھر بار کو خیر باد کہہ کر ایک بھٹ (ریت کے اونچے ٹیلے) کو اپنی جائے قیام بنایا۔ اسی نسبت سے انھیں شاہ بھٹائی کہا جاتا ہے۔ اس بھٹ کو جہاں اب ایک قصبہ آباد ہوگیا ہے۔ "شاہ جو بھٹ" کے نام سے پکارتے ہیں۔ شاہ کا بھٹ حیدر آباد سے ۳۵ میل شمال مشرق میں واقع ہے۔ کراچی سے پشاور جانے والی پختہ سڑک اس قصبہ سے گذرتی ہے۔ شاہ کی آمد سے پہلے یہ مقام قطعی غیر آباد تھا۔ مگر رفتہ رفتہ یہاں آبادی بڑھنے لگی۔ ابتدا میں یہاں شاہ عبداللطیف نے ڈیرہ ڈالا۔ پھر آپ کا خاندان یہیں آ کر آباد ہوگیا۔ اس کے بعد آپ کے عقیدتمندوں نے بھی یہیں پڑاو ڈالنے شروع کردئے۔ یہ شاہ کا فیضان

تھا کہ چند ہی دن بعد یہ اجاڑ۔ سنسان اور ویران مقام ایک بڑے قصبے میں تبدیل ہوگیا جس کی آبادی اس وقت چار ہزار سے زیادہ ہے۔ چار ہزار کی آبادی کا قصبہ سندھ میں جہاں بعض گاوں صرف دو تین گھروں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ بہت بڑا مقام سمجھا جاتا ہے۔ شاہ صاحب ایک مرتبہ آباد ہوجانے کے بعد زندگی بھر یہیں رہے اور اسی مقام پر سنہ ۱۷۵۲ع میں ان کا وصال ہوا۔

ان کی وفات کے متعلق عجیب قصے مشہور ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ مروج یہ ہے کہ شاہ صاحب ایک دن ایک محفل سماع میں شریک ہوئے۔ جب محفل گرم ہوئی تو شاہ صاحب پر حال کی کیفیت طاری ہوگئی۔ یہ کیفیت تین دن تک لگاتار جاری رہی۔ اس اثناء میں قوالی برابر ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ اسی عالم بے خودی میں شاہ صاحب اپنے محبوب حقیقی سے جاملے۔ آپ کے عقیدت مند اس واقعہ سے اتنے متاثر ہوئے کہ آپ کو اسی جگہ دفن کردیا۔ جہاں آپ نے اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کی تھی۔ کچھ دن کے بعد کلہوڑو خاندان کے فرماں روا میاں غلام شاہ نے جو شاہ عبداللطیف کا معتقد تھا۔ آپ کے مزار پر ایک عالی شان مقبرہ بنوادیا۔ یہ مقبرہ عرب اور مغل فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اس علاقے میں ایسے حسین فن کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں۔

شاہ عبداللطیف اپنے جذب و کشف کے لئے ہی مشہور نہیں ہیں۔ فلسفی اور شاعر و فنکار کی حیثیت سے بھی ان کا مقام بہت بلند ہے۔ اس کے علاوہ وہ عربی۔ فارسی اور ہندی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ انھوں نے زبانوں کے محاوروں۔ روزمرہ اور ضرب الامثال کو اتنی خوبی سے سندھی میں منتقل کیا ہے کہ اب یہ جواہر پارے سندھی ادب کا بے نظیر سرمایہ ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ شاہ صاحب اونچے درجے کے ماہر السنہ تھے اور انھیں تحریر و تقریر پر انتہائی قدرت حاصل تھی۔ مگر ان کا یہ علم اور فن ان کی ذاتی صلاحیتوں اور خداداد قابلیتوں کا مرہون منت تھا۔ انھوں نے زندگی بھر کسی کے سامنے زانوئے ادب تہہ نہیں کیا۔ انھوں نے عمر بھر کسی مدرسہ میں تعلیم نہیں پائی۔ یہ محض علم مجلسی اور بزرگوں کے صحبت کا اثر تھا۔ جس نے ان کے ذہن و دل پر صیقل کا کام کیا۔

سندھی زبان میں شاہ عبداللطیف کے رتبے کا کوئی دوسرا شاعر آج تک پیدا نہیں ہوا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ موجودہ سندھی شاعری اپنے گداز اور شیرینی کے لئے بہت بڑی حد تک شاہ صاحب کی مرہون منت ہے۔ سندھی شاعری میں "وائیوں" اور "کافیوں" کے ایجاد اور ترویج کا سہرا شاہ صاحب ہی کے سر ہے۔ ان سے پہلے سندھی شاعر بھی دو بیڑوں (دوہوں) کی دنیا سے باہر قدم نہ نکال سکے تھے۔ اس اعتبار سے شاہ صاحب کا مقام حضرت امیر خسرو کے برابر ہے جنھوں نے اردو اور ہندی زبان میں ٹھمریوں کی بنا ڈالی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب کو سندھی شاعری کے حقیقی بانی کا نام دیا گیا ہے۔

شاہ صاحب کی شاعری کی جان ان کی حقیقت پسندی ہے۔ اچھے فن کا معیار یہ ہے کہ وہ حقیقی زندگی سے بہت قریب ہو۔ یہ بات اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب فن کار ایک طرف خود آگاہ ہو اور دوسری جانب ماحول کا پورا شعور رکھتا ہو۔ وہ ماحول،"
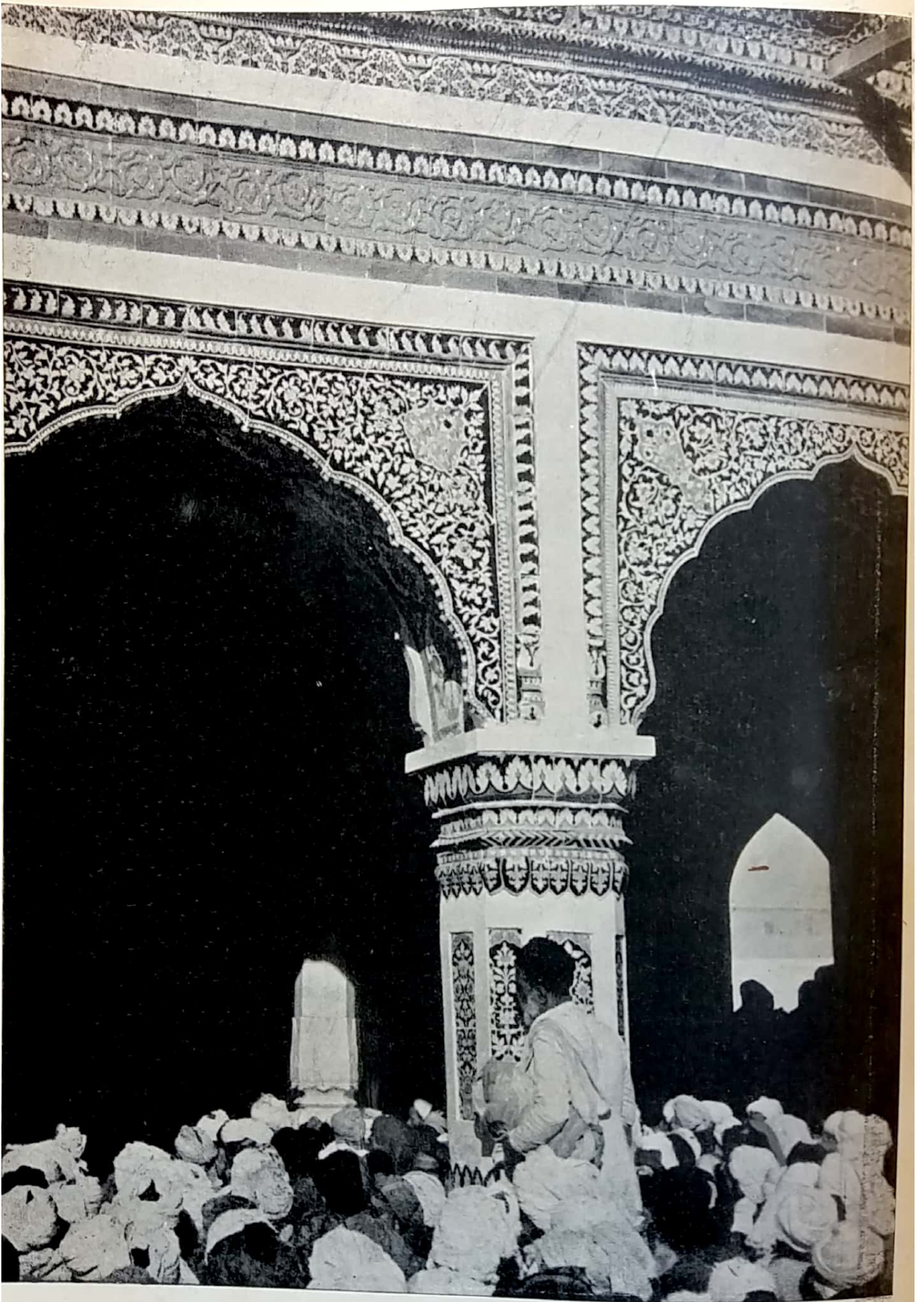
روضہ کی ایک اور تصویر۔ عمارت کے نقش و نگار دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں

تماشائی کی حیثیت سے نہ دیکھتا ہو بلکہ اس میں زندگی بسر کرتا ہو۔ اس کا جزو لاینفک ہو۔ ماحول اس کے دل و دماغ میں رس بس گیا ہو۔ اس صورت میں جو لفظ اس کی زبان سے نکلے گا۔ وہ صرف اس کے دل کی آواز نہ ہوگا۔ بلکہ ماحول کے ہر فرد اور ہر ذرہ کے دل کی آواز ہوگا۔ اس کی داستان ہر شخص کی داستان ہوگی۔ اس کا ہر مصرعہ حقیقت ہوگا جو اپنے آپ کو نہ ماننے والوں سے بھی منوالے گا۔ شاہ عبداللطیف تارک الدنیا ہوکر بھی دنیا والے تھے۔ انھوں نے سندہی عوام کے جذبات و احساسات کا نہ صرف گہرا مطالعہ کیا تھا بلکہ ان میں زندگی گذاری تھی۔ انھوں نے اپنے ماحول کو ایک حقیقت کی حیثیت سے اپنے پوری شخصیت پر طاری کرلیا تھا۔ اسی لئے انھوں نے اپنی شاعری کا موضوع گل و بلبل کے افسانوں اور طور و یمن کی داستانوں کو نہیں بنایا بلکہ سندہ کی عوامی کہانیوں یعنی "عمر ماروی" "سسی پنوں" اور "لیلا چنیسر" کو اپنے فن کی زیبائش کے لئے منتخب کیا۔ انھوں نے اپنی زندگی کے سوز و گداز۔ اپنے بیان کی ندرت اور اپنے عشق کی سرمستی سے ان سادہ کہانیوں میں جان ڈالی اور انھیں نیا رنگ دے کر ان کا مرتبہ پہلے سے بہت بلند کردیا۔ حقیقت پسندی کی مناسبت سے انھوں نے اپنے فن کی بنیاد خلوص۔ سادگی اور صداقت پر رکھی اور ہمیشہ سلیس و شستہ عوامی زبان استعمال کی۔ ان کے کلام کو ہر عالم اور دہقاں سمجھ سکتا ہے۔ اور اپنی سمجھ کے مطابق اس سے محظوظ ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پیام کو لوگوں نے غور سے سنا اور ان کی شاعری کو قبولیت عام حاصل ہوئی۔ شاہ صاحب نے دنیاوی نام و نمود اور جاہ و حشمت کو ٹھوکر ماردی تھی۔ مگر شاہانہ اعزاز و تکریم نے آگے بڑھ کر خود ان کے قدم چومے اور ان کی شاعری کئی سو سال کے بعد آج بھی خراج تحسین وصول کر رہی ہے۔

شاہ عبداللطیف کا دیوان "شاہ جو رسالو" سندہ کے گوشے گوشے میں عقیدت کے ساتھ پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ اس رسالے نے سندہی زبان پر بہت فتحمندانہ اثر ڈالا ہے اور سندہی زبان کو در ہائے معانی سے مالا مال کردیا ہے۔ آج اس رسالے کے سینکڑوں اشعار زبان زد خاص و عام ہیں۔ بے شمار مصرعوں نے ضرب الامثال کی حیثیت حاصل کرلی ہے اور ہزاروں ترکیبیں روز مرہ کے طور پر مستعمل ہیں۔ اگر کسی شخص کو رسالے کے بہت سے اشعار یاد نہیں ہیں تو اسے سندہ میں "پڑھا لکھا" شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اب چونکہ دنیا بھر کے عوام ایک ہی سے ہوتے ہیں۔ ایک ہی سے مسائل رکھتے ہیں۔ ایک ہی سی دلچسپیاں رکھتے ہیں۔ ایک ہی جیسے دل سب کے سینوں میں دھڑکتے ہیں۔ لہٰذا ناممکن ہے کہ شاہ کے رسالے کی مقبولیت محض سندہ کے حدود میں محبوس ہو کر رہ جائے۔ اس وقت تک شاہ صاحب کا ہمہ گیر کلام سندہ کی دیواریں توڑ کر کسانوں اور کاشتکاروں کے کچھہ۔ کاٹھیا واڑ۔ خاران اور لس بیلہ تک پہونچ چکا ہے۔ یہی نہیں بلکہ سمندر پار کے ممالک بھی اس کی جانب متوجہ ہونے لگے ہیں۔ ایک فاضل متشرق ڈاکٹر سورلے نے ایک کتاب "شاہ عبداللطیف آف بھٹ" لکھی ہے۔ اس تصنیف میں شاہ عبداللطیف کی شخصیت۔ ان کی زندگی اور کمالات کا بدقت نظر جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب کو لکھے ہوئے دس گیارہ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس کی بنا پر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ

شاہ عبداللطیف بہت جلد دنیا کا ایک روشن ستارہ بن جائیں گے اور چونکہ چاند ستاروں کی روشنی کسی صوبے یا ملک تک محدود نہیں ہوا کرتی۔ لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ شاہ صاحب سقراط کی طرح ساری دنیا کے معزز شہری ہیں۔

شاہ صاحب کے سندھی کلام کا رتبہ کسی طرح رومی کے فارسی کلام سے کمتر نہیں۔ رومی کی مثنوی کے قصے ہر مسلمان گھر میں زبانوں پر ملتی ہیں۔ عمر اور رومی قاصر۔ موسیٰ اور شبان وغیرہ کی کہانیاں ہر پڑھا لکھا مسلمان جانتا ہے۔ بالکل اسی طرح شاہ عبداللطیف کی کہانیاں۔ جن کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔ ہر سندھی کی زبان پر ملیں گی۔ پھر لطف یہ ہے کہ صرف کہانیاں ہی نہیں ہیں۔ ان میں اعلیٰ درجے کے روحانی سبق بھی ملتے ہیں۔ ان میں حکیمانہ تعلیمات۔ اسرار حیات۔ رموز حقیقت اور مکارم اخلاق غرض سبھی کچھ موجود ہے۔ رومی کی طرح شاہ بھٹائی نے بھی اپنی خوشہ چینی کے لئے صرف ایک ہی چمن کو منتخب کیا ہے اور وہ ازلی و ابدی چمن قرآن ہے۔ جس طرح رومی کے کلام کے متعلق آج ہر صاحب دل یہ مانتا ہے کہ "۔

ہست قرآں در زبان پہلوی

اسی طرح شاہ عبداللطیف کے اس فرمان کو بھی شاعرانہ تعلی نہ سمجھنا چاہئے کہ "اس کلام کو معمولی اشعار پر محمول نہ کیجئے۔ یہ آیات ربانی ہیں"۔

"شاہ جو بھٹ" کے مقام پر اس عظیم صوفی و شاعر کا عرس سال میں دو مرتبہ ہوتا ہے۔ پہلا عرس ۹ ذی الحجہ کو یعنی خاص حج کے دن منعقد ہوتا ہے اور دوسرا ۱۴ صفر کو۔ یہ دونوں عرس تین دن جاری رہتے ہیں۔ ان تین دن میں یہاں بہت بڑا میلہ لگتا ہے جس میں ایک ڈیڑھ لاکھ سندھی شریک ہوتے ہیں۔ محفل سماع کے علاوہ۔ جس کے متعلق مشہور ہے کہ شاہ صاحب کے زمانہ حیات سے روزانہ بلا ناغہ ہوتی رہتی ہے۔ اس عرس کی دو باتیں خاص دلچسپی کا باعث ہوتی ہیں۔ ایک مجلس شعر خوانی جس میں دور و نزدیک کے سندھی شعراء شرکت کرتے ہیں اور شاہ صاحب کی شان میں قصیدے پڑھتے ہیں۔ شعر خوانی کی یہ مجلس سندھ کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اور اس کا منظر قریب قریب ویسا ہی ہوتا ہے جیسا اسلام سے پہلے بازار عکاظ میں عرب کے نامور شعراء کی مجلسوں کا ہوا کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ سندھی مسلمانوں کی اکثریت عرب نسل سے ہے۔ دوسری اہم چیز کشتی ہے۔ جسے سندھی میں "ملا کھڑا" کہتے ہیں۔ ان کشتیوں میں حریف مقابل کو چاروں شانے چت کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ زمین پر کسی بل پچھاڑ دینا کافی ہے۔ عموماً ان کشتیوں کے لئے اکھاڑے نہیں بنائے جاتے ہیں۔ لوگ ایک بڑا حلقہ باندھ کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ دو پہلوان میدان میں اترتے ہیں۔ ان میں سے ایک ذرا فاصلے پر بیٹھ جاتا ہے اور دوسرا اس پر حملہ آور ہوتا ہے۔ ہاتھ ملتے ہی دونوں ایک دوسرے سے گتھم جاتے ہیں۔ کسی ایک کے گرتے ہی کشتی ختم ہوجاتی ہے۔ فاتح پہلوان مسرت سے رقص کرنے لگتا ہے اور اسی حالت میں حلقہ کا چکر لگاتا ہے جہاں لوگ اسے انعامات دیتے ہیں۔

(روز نامہ امروز کے شکریہ کے ساتھ)

شاعر، مفکّر اور فلسفی

آصف انور جیلانی

سندھ کے مشہور شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی سر زمین سندھ میں اسی طرح مقبول ہوئے جس طرح کہ اردو میں غالب اور اقبال۔ سندھ کا یہ شاعر اور ولی آج سے تین سو سال قبل حیدر آباد سندھ کے ایک قصبہ ہالا میں جرریوتا خاندان میں پیدا ہوا۔ جو سندھ کا ایک بہت ہی معزز اور مذہبی حیثیت سے بہت ممتاز خاندان تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انھوں نے باقاعدہ تعلیم نہیں پائی لیکن بعض کہتے ہیں کہ بڑے ہونے پر حسب معمول ان کی تعلیم و تربیت ایک استاد کے حوالے کی گئی۔ مگر قدرت نے انہیں اتنی استعداد عطا کی تھی کہ وہ نہ صرف اپنی زبان کے ادب پر حاوی تھے بلکہ عربی اور فارسی سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ اس زمانہ میں اسلامی ثقافت کی تعلیم انہی دو زبانوں میں دی جاتی تھی۔ کم عمری ہی سے شاہ عبداللطیف کی یہ عادت تھی کہ وہ جنگلوں میں نکل جاتے اور کسی گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر فطرت اور اس کے عطیات پر غور و فکر کیا کرتے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ کئی دن تک غور و فکر میں اس قدر محو رہے کہ آس پاس کی مٹی نے اڑ اڑ کر ان کا پورا جسم ڈھانک لیا۔ ان کے والد حبیب شاہ حیران و پریشان شاہ صاحب کو ڈھونڈھتے ہوئے جب اس مقام پر پہنچے جہاں یہ ریت میں دبے پڑے تھے۔ تو اپنے فرزند کی اس حالت کو دیکھ کر باپ نے ایک سندھی مصرعہ کہا جس کا مفہوم ہے:-

"بے قرار ہواؤں نے اتنی تیزی برتی کہ تیرا تمام جسم مٹی سے ڈھک گیا"۔

شاہ عبداللطیف نے اس کے جواب میں برجستہ مصرع کہا:-

"میں صرف اپنے محبوب کے خوبصورت چہرہ کے دیدار کے لئے زندہ ہوں"۔

نوجوانی کے زمانہ میں شاہ عبداللطیف بھی عشق کے تیر سے محفوظ نہ رہ سکے۔ واقعہ اس طرح ہے کہ ایک مقامی رئیس مرزا مغل بیگ کی لڑکی بیمار ہوئی اور شاہ عبداللطیف کو دعائے صحت کے لئے طلب کیا گیا۔ شاہ لطیف لڑکی کو دیکھتے ہی دل اس کے حسن کو نذر کر بیٹھے اور پھر انھوں نے شادی کا پیغام پہنچایا۔ لیکن لڑکی کے والدین نے انکار کردیا۔ مایوسی نے شاہ لطیف کو دیوانہ بنادیا اور یہ مایوسی۔ یہ حسرت اور یہ آرزوئیں ان کے دل سے اٹھ اٹھ کر لب سے آہیں بن کر نکلنے لگیں اور اسی طرح ان کی شاعری کی ابتدا ہوئی۔

آخرکار نا امید ہوکر انہوں نے تہیہ کیا کہ وہ گھر بار چھوڑ کر باہر نکل جائیں اور اس حسین چہرہ کو فراموش کر سکیں- ایک دن سنیاسیوں کی ایک جماعت ان کے گاوں سے گزری- شاہ لطیف ان کے ساتھ ہوگئے- انھوں نے چلتے ہوئے اپنی والدہ کو یہ الوداعی پیغام لکھ بھیجا۔-

"اے ماں! اب میں نے اپنے کپڑے زعفرانی بنانے اور جسم پر راکھ ملنے کا ارادہ کرلیا ہے- میں سنیاسیوں کے ساتھ جاوں گا- مجھے امید ہے کہ تم مانع نہ ہوگی- میں نے یہ راہ اس لئے اختیار کی ہے کہ اپنے محبوب کی تلاش کر سکوں"-

شاہ لطیف نے یہ الوداعی پیغام لکھ کر بھیجدیا اور سنیاسیوں کے ساتھ روانہ ہوگئے- اس زمانہ میں انھوں نے سندھ- کچھ- کاٹھیاواڑ اور لسبیلہ کے متعدد مقامات دیکھے- کئی سال تک جگہ جگہ کی خاک چھاننے کے بعد سنیاسیوں کی قربت سے متنفر ہو کر انہوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور اپنے وطن واپس آنے کی ٹھانی- راستہ میں ٹھٹھہ کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ غار میں ایک آدمی کچھ اشعار پڑھ رہا ہے اور شعر و نغمہ میں مصروف ہے- شاہ لطیف نے اس کو اپنی طرف متوجہ کیا مگر کوئی جواب نہ ملا- آخر وہ اپنی داستان اس شرط پر سنانے کو تیار ہوگیا کہ جس شعر کا کچھ حصہ جو اسے یاد ہے اور باقی ذہن سے محو ہوگیا ہے اسے شاہ صاحب پورا کریں- شاہ لطیف نے اسے پورا شعر سنادیا- مگر اصل میں یہ شعر خود شاہ لطیف ہی کا تھا- اور اسے انھوں نے پورا کردیا تھا۔-

"اگرچہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ مجھے بلند چٹیل میدانوں- پہاڑوں اور تنگ راستوں پر سے گزرنا ہوگا- لیکن میں اپنے محبوب کے غم کو لئے جو میرے ہمراہ ہمیشہ رہے گا- تمام مشکلات سے گزر جاوں گا"-

کہتے ہیں کہ پورا شعر سن کر اس شخص پر رقت طاری ہوگئی اور اس نے روتے روتے وہیں جان دیدی- اس آدمی کو دفن کرکے شاہ صاحب ٹھٹھہ آئے اور وہاں کے علماء فن اور صوفیائے کرام سے ملاقات کی- صوفیائے کرام نے اس موقع کو غنیمت جانا اور انھیں اس پر آمادہ کرلیا کہ وہ اپنے وطن میں قیام کرکے لوگوں میں تصوف کی تبلیغ کریں-

اپنے وطن پہنچ کر شاہ صاحب کو معلوم ہوا کہ جس لڑکی کی محبت میں وہ گرفتار ہوئے تھے- اس کے والد کو ڈاکوؤں نے قتل کردیا ہے- لڑکی کی والدہ نے یہ سمجھا کہ لڑکی کے والد شاہ لطیف کی بد دعا ہی کی وجہ سے قتل ہوئے ہیں- اسی لئے شاہ صاحب کی رضا کے لئے لڑکی کا عقد ان سے کردیا- شادی کے بعد شاہ لطیف کوٹری سے بھٹ نامی مقام پر منتقل ہوگئے-

بھٹ سندھی زبان میں "ٹیلہ" کو کہتے ہیں- یہ مقام بے حد روح پرور اور دلکش تھا- جہاں خوش الحان پرندے اپنے نغمہ سے اس خوش منظر مقام کو ایک نئی روح بخشتے تھے- شاہ لطیف نے بھی اسی جگہ تصوف کی تعلیم کا ارادہ کیا- اور اس خبر کو سن کر ہر خاص و عام یہاں انکی زیارت کو آتے اور ان کی تعلیم سے مستفید ہوتے- روزانہ عشاء کی نماز
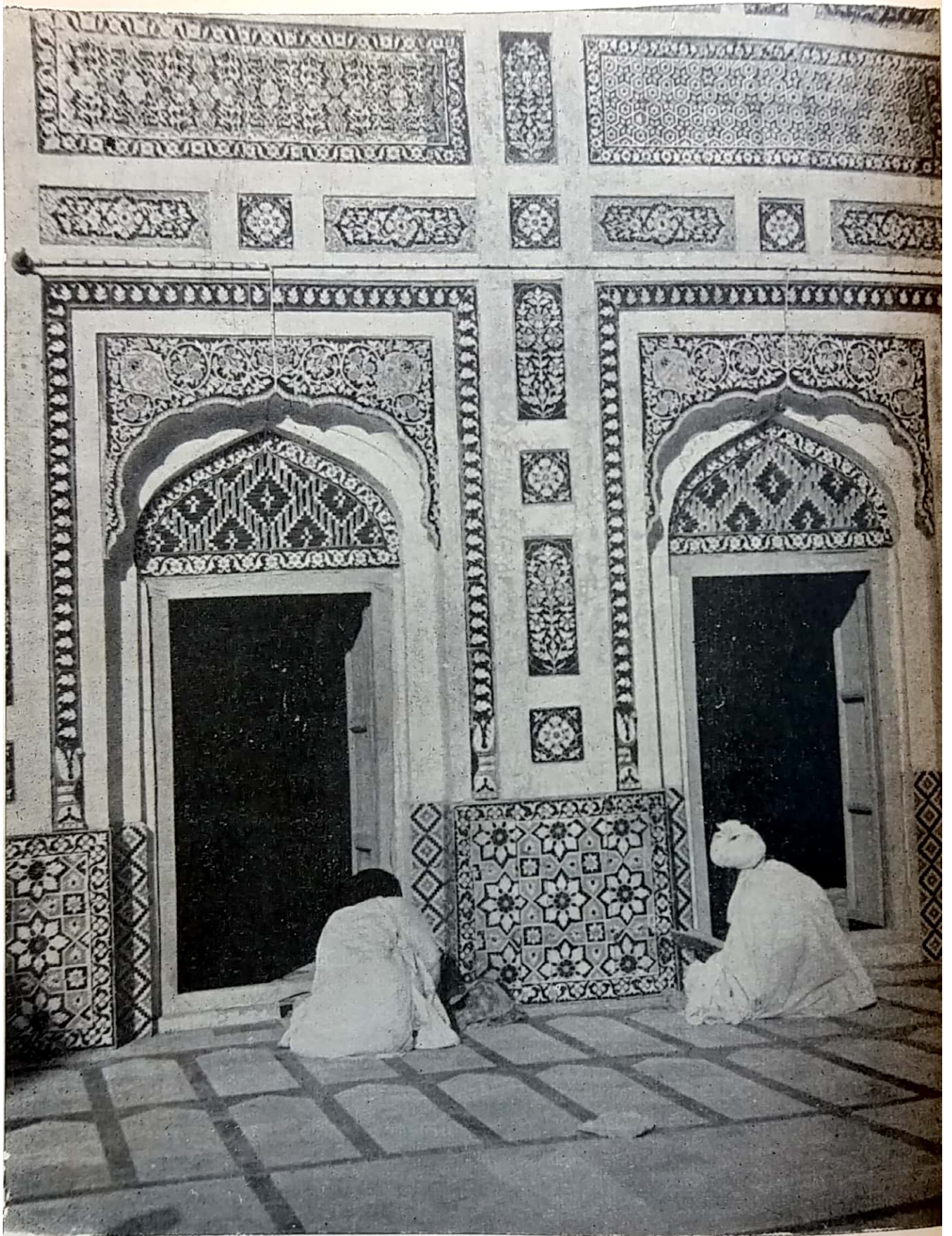
روضہ سے ملحق تاریخی مسجد کا بیرونی حصہ

کے بعد محفل سماع و سرود منعقد ہوتی- شاہ لطیف برجستہ اشعار کہتے اور سماع و سرود کا سلسلہ جاری رہتا- محفل میں شرکت کرنے والے اپنے دکھ درد بھول کر خدا کی ذات کی طرف رجوع ہوجاتے-

شاہ لطیف نے ۸۰ سال کی عمر میں اسی مقام پر انتقال کیا اور اسی جگہ دفن کئے گئے- سندھ کے ایک مشہور بادشاہ غلام شاہ نے ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کرایا جو اپنی قدیم شان و شوکت کے لئے آج بھی سندھ کے مشہور شاعر کو اپنی گود میں لئے ہوئے ہے-

شاہ صاحب کے زمانہ میں عوام گھن کی طرح پسے جا رہے تھے- ان کی حالت ایک درد مند دل کو رلائے بغیر نہیں رہ سکتی تھی- شاہ صاحب نے ان کے دکھ کو اپنا دکھ بنایا- ان کے غموں اور آرزوؤں کی ترجمانی کی اور اپنے جادو بھرے کلام سے ان کے دلوں میں ولولہ پیدا کیا اور اسی چیز نے ان کو عوام کا چہیتا شاعر بنادیا- اور آج بھی سندھ کی وادی میں ان کے میٹھے نغمے فضاؤں میں برابر گونج رہے ہیں-

شاہ عبداللطیف نے سندھی شاعری میں نئی نئی طرزیں نکالیں- مثلاً ان کی ایک اختراع "وائی" ہے یہ باقاعدہ شاعری یا کلام موزوں کی بجائے بیساختہ بول ہیں جو سر اور لے کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں- یہ کلام بآواز بلند گایا جاتا ہے اور نہایت عجیب کیف پیدا کرتا ہے- شاہ صاحب نے یوں تو سندھی شاعری کی ہر قسم میں شعر کہے ہیں جو ان کی ایک کتاب یعنی "شاہ جو رسالو" میں جمع کئے جاچکے ہیں- مگر انہوں نے زیادہ تر وائی اور کافیاں ہی کہی ہیں اور اس سے بخوبی ظاہر ہے کہ ان کی بنیاد شاعری سے زیادہ موسیقی اور غنا پر ہے اور اسی وجہ سے ان کے "رسالہ" میں ہر باب "سر" کے نام سے پکارا جاتا ہے- شاہ صاحب کے اس رسالہ میں کل ۳۶ سر ہیں- بعض جگہ ان سروں کے نام بھی بیان کئے گئے ہیں مثلاً "ایمن کلیان" "سارنگ" وغیرہ- مگر بعض سروں کا نام نفس مضمون کو ہی مقرر کیا گیا ہے- مثلاً سر سسی- سر حسینی- سر سوہنی وغیرہ- اور یہ راگ اپنے خاص- منتخب راگوں ہی میں گائے جاتے ہیں-

شاہ صاحب کے بیتوں اور وائیوں میں زندگی اور تصوف کا گہرا نکتہ ہوتا ہے- ان کی طبیعت میں وجدان کا عنصر نہایت نمایاں ہے جو انہیں مسلمان صوفیوں کی صف میں کھڑا کرتا ہے- وجدان و عرفان کے دریا کے ساتھ شاعری کا دریا بھی خود بخود موجزن ہوجاتا ہے اور پھر قدرت نے شاہ صاحب کو ایک شاعر کا دل و دماغ عطا کیا تھا- اس لئے وہ ولی ہوتے ہوئے شاعر کامل بھی تھے- اور سامعین کا دل گرمانے کے گر خوب جانتے تھے-

ارسطو کی رائے کے مطابق محاکات یعنی مصوری یا نقش نگاری شعر کی روح ہے- ادب کے دو عالموں کا ارشاد ہے کہ تخیل شعر کی روح ہے- حقیقت میں محاکات اور تخیل دونوں ہی شعر کا لازمی جزو ہیں- محاکات کے معنی ہیں کسی چیز یا حالت کا اس طرز پر بیان کرنا کہ اس کی ہو بہو تصویر پڑھنے والے یا سننے والے کے سامنے اتر جائے اور تخیل سے شاعر سامعین کے جذبات میں جنبش پیدا کرتا ہے- شاہ صاحب کے کلام میں یہ دونوں خصوصیتیں موجود ہیں-

شاہ صاحب محاکات کے ماہر ہیں۔ شاہ کی نقش نگاری ہر ایک بیت میں جھلکتی نظر آتی ہے۔ سر سوہنی میں شاہ صاحب دریا کی دہشتناک صورت اس طرح کھینچتے ہیں:۔

دهشت ڏوم درياهه ۾ جت جايون جانارن،
ڪو سندو سير جو، مپ نه ملاحن،
درندا درياهه ۾، واڪا ڪيو ورن،
سڄا ٻيڙا ٻار ۾، هليا هيٺ وڃن،
پرزو پيدا نه ٿيو، تختو منجهان تن،
ڪوجو ڦهر ڪنن ۾، جڻ وڏا ڪين ورن،
اتي اڙ تارن، ساهڙ سير لنگهائيين.

شاہ صاحب چاند سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں:۔

چنڊ تهجي ذات، پاڙيان تان نه پرين سين،
تون اڄو ۾ رات، سڄڻ نت سوجهرا.

شاہ صاحب کے یہاں ان کے سروں میں شروع سے آخر تک صوفیانہ تخیل کا بہت گہرا پرتو ہے۔ وہ اپنے دوہوں میں اس زمانہ کے رواج کا پس منظر پیش کرتے ہیں۔ اس زمانہ میں چرخہ چلانے اور سوت کاتنے کو ایک ہنر سمجھا جاتا تھا۔ اسی چیز کو انھوں نے کنایتاً اپنے سر میں بیت کرکے ایک سیدھے سادے انداز میں تصوف کا اہم نکتہ پیش کردیا ہے۔ خصوصاً عمل اور حسن عمل کے بارے میں صوفیائے کرام کا جو نکتہ ہے وہ واضح کیا ہے۔ مثلاً شاہ صاحب کہتے ہیں:۔

ڪتڻ جي ڪاڻ ڪرين سٽي ساهين هڏ،
صبح ايندءِ اوچتي، عيد اگهاڙن گڏ،
جت سرٿيون ڪندءِ سڏ، اُت سڪنديءَ سينگار کي.

"تمھیں سوت کاتنے سے ذرا بھی دلچسپی اور لگاو نہیں۔ تمھیں تو بس سونا چاہئیے اور اپنی ہڈیوں کے لئے آرام۔ یکایک عید کی صبح آجائے گی۔ لوگ نئے کپڑوں سے محروم رہیں گے۔ خود تمھارے پاس بھی پہننے کو اچھے کپڑے نہیں ہوں گے۔ جب تمھاری سہیلیاں تمھیں سنوارنے آئینگی۔

شاہ صاحب نے اپنے "رسالہ" میں مشہور رومانی داستانوں کو تمثیل و تعبیر کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ مگر انھوں نے اس مجازی عشق کے قصہ کو بھی حقیقی عشق کا روپ دیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس کامیابی کے ساتھ ہر داستان کو حقیقی عشق کی داستان میں پیش کیا ہے کہ کسی کو اس کے دلائل سے انکار نہیں ہوسکتا۔

سسی پنوں کے رومانی قصہ ہی کو لیجئے۔ شاہ صاحب نے اپنے اس سر میں پنوں کو حقیقی محبوب۔ سسی کو ایک سالک سے اور بھنور کو ایک دنیا سے تعبیر کیا ہے۔ شاہ صاحب نے اس صندوق کو جس میں سسی کو بند کرکے بہایا گیا تھا۔ طالب کی بے خبری اور

نافہمی بتایا ہے۔ سسی کے حسن کو انھوں نے عمل صالح یعنی نیک کام سے تعبیر کیا ہے۔ سسی کے بالغ ہونے سے مرشد کے کامل ہونے سے مراد لی ہے۔ پنوں اور سسی کی شادی کو طالب اور مطلوب کے وصال سے تعبیر کیا ہے۔

پنوں اور سسی کی وفات اور ایک ہی مقبرہ میں دفن ہونے سے شاہ صاحب نے یہ مراد لی ہے کہ "یوصل المجیب الی الجیب" یعنی دوست سے دوست مل گئے۔ یا طالب اور مطلوب کا ایک حالت میں وصال! مثلاً جیسے پانی پانی میں مل جاتا ہے۔ دودھ دودھ میں اور طالب فنا فی اللہ کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔

غرض یہ تو ایک مثال تھی جس سے شاہ صاحب کے فلسفہ۔ ان کے تخیل۔ طرز فکر اور ان کے دلائل حیات کا ثبوت ملتا ہے۔ انھوں نے ہر سر میں تصوف کے ہر مشکل سے مشکل مسئلہ کو ان رومانی داستانوں کو ایک نئے روپ۔ ایک نئے رنگ میں ڈھال کر اس طرح پیش کیا ہے جس کی مثال میرے خیال میں سندھی شاعری میں تو کیا اردو اور فارسی میں بھی مشکل ہی سے ملتی ہے۔ اور یہی وجوہ ہیں جن کی بنا پر شاہ عبداللطیف بھٹائی جو ٹھیک آج سے دو سو سال گزرے اس سر زمین سے جسمانی طور پر تو جدا ہوگئے ہیں۔ مگر روحانی طور پر ہمارے درمیان موجود ہیں۔

(روزنامہ امروز کے شکریہ کے ساتھ)
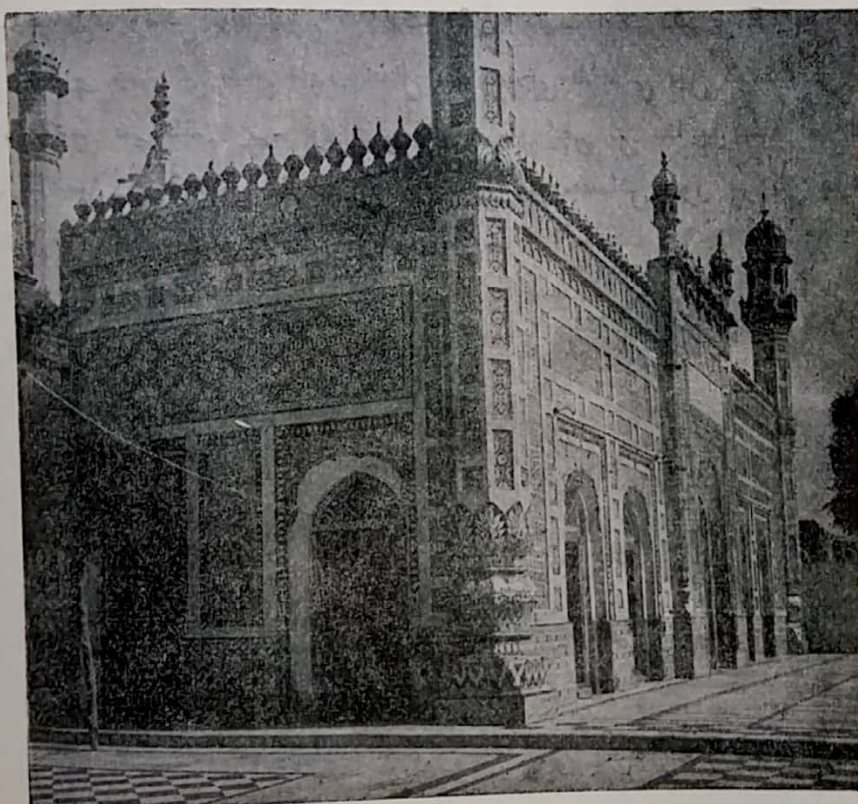
شعلۂ نوا

نصراللہ خاں

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است برجریدہ عالم دوام ما

"سر زمین سندہ پر ایک ایسا حق آگاہ صوفی شاعر گزرا ہے کہ جس کی شعلہ نوائی نے دریائے سندہ کی وادی میں انقلاب کی ایک نئی لہر پیدا کردی- یہ درویش خدا مست شاہ عبداللطیف بھٹائی رحمتہ اللہ علیہ تھے"- کاظمی سادات کا ایک فرد سید حیدر ہرات سے تیموری افواج کے ساتھہ سنہ ۸۰۱ ہجری میں وارد سندہ ہوا- سید حیدر نے ہالہ کی قدیم بستی میں سکونت اختیار کی- "سید حیدر کے خانوادے کے چند افراد بلڑی باسی گاوں میں جاکر آباد ہوگئے- یہ گاوں یعنی بلڑی باسی حیدر آباد سندہ کے جنوب میں واقع ہے- سید حیدر کے خانوادے کی اس شاخ میں سید عبدالکریم ایک بہت بڑے صوفی شاعر گزرے ہیں- جن کے اشعار آج بھی محفوظ ہیں- شاہ عبداللطیف بھٹائی انہی سید عبدالکریم کے پر پوتے اور سید حبیب کے فرزند ہیں- شاہ صاحب کی والدہ ہالہ کے ایک عالم اور درویش کی صاحبزادی تھیں- اس طرح تصوف اور شاعری شاہ عبداللطیف کو ورثہ میں ملی- جب مغلیہ سلطنت کے تاجدار اورنگزیب عالمگیر کا انتقال ہوا اس وقت شاہ عبداللطیف کی عمر ۱۸ سال کی تھی- جن آنکھوں نے مغل اقتدار کا دور دورہ دیکھا- انھیں آنکھوں نے طوائف الملوکی کا زمانہ بھی دیکھا- اور پچاس سال کی عمر میں شاہ صاحب نے دلی پر نادر شاہ کا حملہ دیکھا اور پھر اٹھاون سال کی عمر میں ان کی آنکھوں نے احمد شاہ درانی کا وہ طوفانی حملہ بھی دیکھا جس نے سلطنت دہلی کے رہے سہے اقتدار کو اور زیادہ کمزور کردیا-

شاہ عبداللطیف کی دنیا اس ظاہری دنیا سے الگ تھی- ان کے دل کی لگن کچھہ اور تھی- استغراق اور محویت میں ان کی ساری عمر گزری- شاہ صاحب کے حصول علم کا مسئلہ ایک اختلافی مسئلہ ہے- کہا جاتا ہے کہ انھوں نے فارسی اور عربی باقاعدہ پڑھی تھی- قرآن- مثنوی- مولوی معنوی اور ان کے جد امجد شاہ عبدالکریم کی سندہی مثنوی ہمیشہ ان کے زیر مطالع رہیں- یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ مطلقاً پڑھے لکھے نہیں تھے-

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

حق تو یہ ہے کہ ایک صحیح الفطرت شخص کو خارجی وسائل کی رہنمائی کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے۔ خود اسکی فطرت کی تجلی اس کے دل و دماغ کو منور کرتی رہتی ہے۔ فطرت کی درسگاہ شاہ صاحب کی تعلیم و تربیت کا واحد مکتب تھی۔ سندہی شاعری میں شاہ عبداللطیف کا کوئی ہمسر نہیں۔ ان کی شاعری میں تخیل کی بلند پروازی بھی ہے اور رعنائی افکار بھی۔ ان کا کلام پاکیزہ بھی ہے اور شستہ بھی---ان کے کلام میں سب سے بڑی بات مضامین کا تنوع ہے۔ "مولانائے روم کی طرح شاہ صاحب نے بھی اپنی شاعری کے لئے قدیم قصے منتخب کئے۔ وہ ان قصوں اور کہانیوں کو بیان کرتے کرتے تصوف کے پیچیدہ مسائل کو نہایت سادگی سے بیان کرجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام تصوف۔ ادب اور تاریخ کا شاہکار ہے۔!

شاہ صاحب کے اشعار بہت سادہ ہیں۔ مگر آج تک کوئی ان کے اسلوب کو اپنا نہ سکا۔ اس زمانہ کے سندہ میں صوفی شعراء کا کلام محفل سماع میں ساز و آہنگ کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا۔ اس لئے شعراء اشعار کہتے وقت اس بات کا خاص طور پر اہتمام رکھتے تھے اور اپنا کلام دلپسند دھن یا طرز میں کہا کرتے تھے۔ شاہ عبداللطیف کے کلام میں ایک تو قدرتی طور پر ترنم موجود ہے اور اس پر آپ کا یہ اہتمام کہ اشعار کہتے وقت آپ نے خاص دھن اور خاص لے کا خیال رکھا۔

سندہی شاعری میں کافی۔ بیت۔ وائی۔ ڈھرہ اور لوارد مقبول خاص و عام ہیں۔ شاہ عبداللطیف کی چند کافیوں کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

دوھرہ

سندہی شاعری میں کافی۔ بیت۔ وائی۔ ڈھرہ اور لوارد مقبول خاص و عام ہیں۔ اپنے محبوب کے بارے میں کہتی ہے کہ:۔

واجھائي وطن کي ساري ڏيان ساهه،
بت منهنجو بند ۾ قيد م ڪريجاهه،
پر ڏيهاڻي پرين ري دار م ڌريجاهه،
ٿڌي وسائج ٿرن جي مٽي مٺي مٿاهه،
جي پويون لڳي پساهه ته نجاهه مڙه ملير ڏي.

میری خواہش ہے کہ اپنے وطن کو دیکھتے دیکھتے میں جان دے دوں۔
"میرے جسم کو قید نہ کرنا۔
پردیسن کو اس کے محبوب سے جدا نہ کرنا۔
میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے وطن تھر کی ٹھنڈی ٹھنڈی مٹی اپنے سر پر ڈال لوں۔
اگر میں پردیس میں مرجاوں تو میری نعش کو ملیر میں دفن کرنا"۔

کافی شاہ عبداللطیف رحمتہ اللہ علیہ

واڳ، ڏٺي تنهنجي وس آءُ ڪا پاڻ وهيٺي،
هلايو تان بي هلي وڃان ٻهاريو تان ٻس،
ويندس رهندس ڪين ڪي منهنجي پنهور ڪان ٻس،
اديون شاه لطيف چوي دل جو دشمن دس.

"اے خدا جو کچھ ہے- تیرے بس میں ہے اور ہمارے بس میں کچھ بھی نہیں-

میرا چلنا پھرنا تیرے اختیار میں ہے اور میرا قیام بھی تیرے اختیار میں ہے-

سسی کہتی ہے کہ میں پنوں کے پاس جاوں گی اور بھنبور سے میری توبہ ہے-

اے بہنو! شاہ لطیف کہتے ہیں کہ دل کے دشمن کو مات دو"-

ٿيندو تن طبيب دارون منهنجي درد جو،
ڪي ڏينم پاڄهہ جي اچي شال عجيب،
پرين اچي پاڻ ڪيو سنڌو غور غريب،
ڏکندو سڀوئي ڏور ڪيو منهنجو تن طبيب،
اديون عبداللطيف چي حاذق آهہ حبيب.

"میرا محبوب میرے درد کا درماں ہوگا-

جب میرا محبوب آئیگا تو وہ میرے (حال زار پر) رحم کریگا- (اور) میرا درد میرے طبیب نے (محبوب نے) دور کردیا-

اے بہنوں! عبدالطیف فرماتے ہیں کہ میرا حبیب بہت بڑا حاذق ہے"-

سر زمین پاکستان اور وادی سندھ کا یہ عارف- پاک باطن صوفی شاعر عبداللطیف بھٹائی جس نے اپنے کلام کے ذریعہ تصوف کو جمالیات سے ہم آہنگ کردیا- آخری عمر میں ایک ریگستانی ٹیلے پر آ کر رہا- یہ ٹیلہ حیدر آباد سے بتیس میل شمال کی طرف ہے- ریگستانی ٹیلے کو سندہی زبان میں بھٹ کہتے ہیں- شاہ عبداللطیف کا یہ مسکن ان کے نام سے منسوب ہوگیا- یعنی بھٹ شاہ کے نام سے- اسی مقام پر سنہ ۱۷۵۲ع میں شاہ صاحب نے انتقال فرمایا- آپ کا مزار غلام شاہ کلہوڑہ نے تعمیر کروایا- آج یہ مزار اہل نظر کی زیارت گاہ ہے- یہاں ہر سال صفر کی چودہ تاریخ کو نہایت تزک و احتشام سے عرس منایا جاتا ہے-

L (IV) 643—13

روضہ کا بالائی حصہ
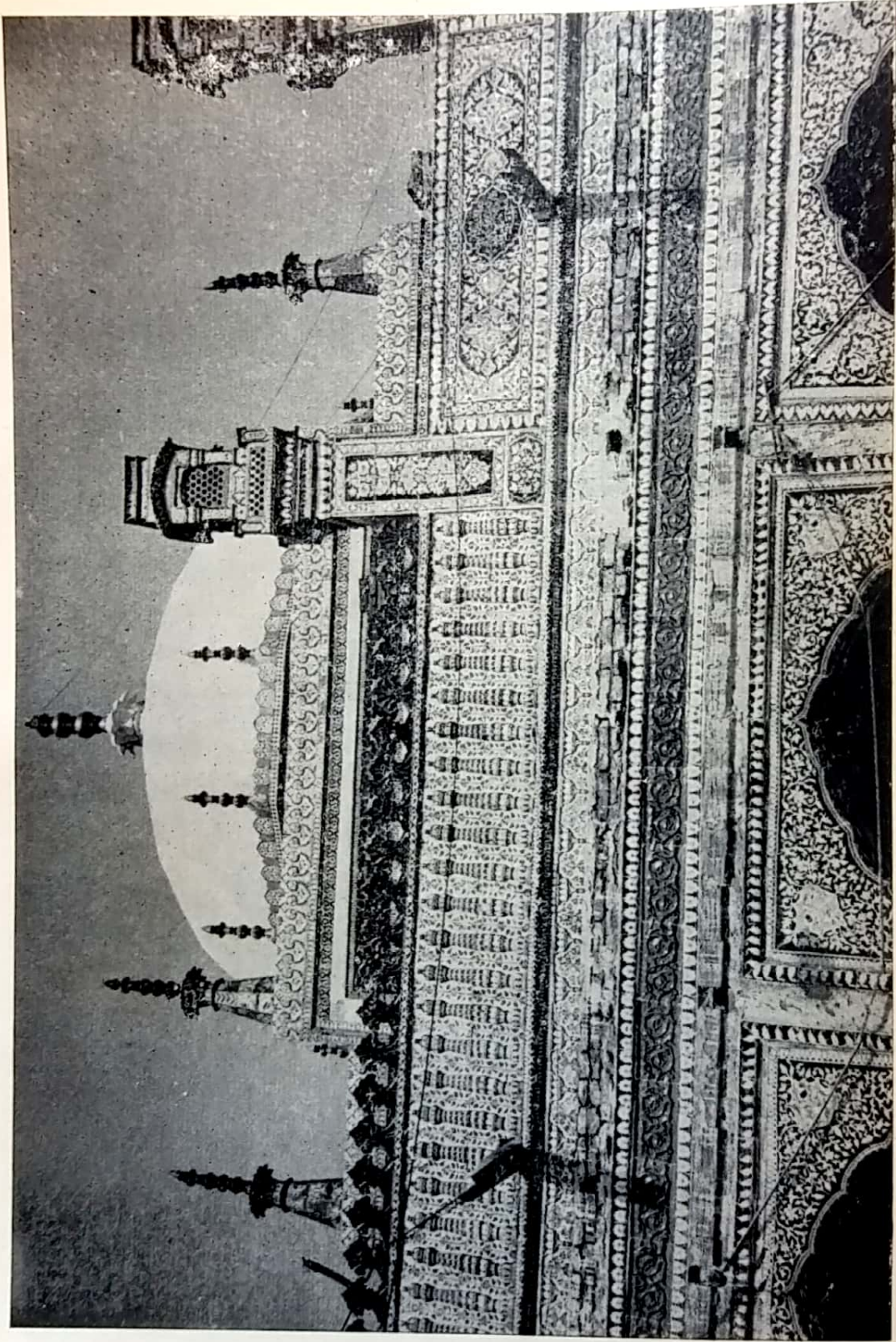
مٹیاری کے مقام پر علوی سیدوں کا ایک معزز گھرانہ آباد تھا۔ اس گھرانہ کے بزرگ ہرات سے سندھ آئے اور یہیں آباد ہوگئے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ شاہ عبدالکریم نے بڑی شہرت پائی۔ شاہ عبدالکریم اپنے زمانے میں سندھ کے سب سے بڑے صوفی شاعر اور درویش تھے۔ آپ نے لاتعداد کافیاں کہیں اور سندھ کے ذرے ذرے کو تابانی بخشی۔ شاہ عبدالکریم کی روحانیت۔ پارسائی اور شاعری ان کی محبت اور شفقت دور دور سے لوگوں کو کھینچ کے ان کے دروازے پر لائی۔ لاتعداد لوگ ان کے مرید ہوئے اور ان سے فیض پایا۔ شاہ عبدالکریم کا مزار بلڑی ضلع حیدر آباد میں اب بھی مرجع خاص و عام ہے۔ اب بھی سینکڑوں ہزاروں زائرین عرس کے موقع پر بلڑی جاتے اور اپنے اپنے بے تاب دلوں کی پیاس بجھاتے ہیں۔ شاہ لطیف انہی شاہ عبدالکریم کی چوتھی پشت سے ہیں۔

شاہ عبدالکریم بلڑی میں رہتے تھے۔ یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ ان کا خاندان مٹیاری سے بلڑی کب آیا۔

شاہ عبدالکریم کے بعد ان کی اولاد پھر مٹیاری کے قرب و جوار میں آباد ہوگئی۔ شاہ لطیف کی پیدائش کے وقت ان کے والد شاہ حبیب ہالا حویلی کے مقام پر آباد تھے۔ یہ قصبہ مٹیاری کے قریب تھا۔ اب چند ٹوٹی پھوٹی قبروں اور کھنڈروں کے سوا جو اس کی بے رونقی اور بربادی پر نوحہ خواں ہیں اب وہاں کچھ بھی نہیں۔ اس قصبے کے اجڑے ہوئے کھنڈروں کو دیکھ کر آج کون کہہ سکتا ہے کہ کبھی یہ جگہ بارونق اور آباد تھی اور وہ شعاع نور یہیں پھوٹی تھی جس نے بھٹکے ہوئے سندھ کو امن و آشتی اور محبت کا راستہ دکھایا اور مایوسی اور بے چینی کے تاریک سمندروں میں ڈوبتے ابھرتے سندھیوں کو امید اور سکون کی دولت بخشی۔

شاہ لطیف سنہ ۱۶۸۹ع میں پیدا ہوئے۔ شاہ حبیب شاہ عبدالکریم کے فیض اور اپنی ذاتی پارسائی کی وجہ سے اپنے علاقے کے برگزیدہ شخص تھے۔ ان کے عقیدت مندوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ دھن دولت کی بھی کوئی کمی نہ تھی۔ لنگر جاری تھے۔ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے رہتے تھے جو ان کے آستاں سے دینی اور دنیاوی نعمتوں سے جھولیاں بھر بھر کے لے جاتے تھے۔ شاہ لطیف کی پیدائش پر بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ دور دور سے لوگ شاہ حبیب کے بیٹے کو دیکھنے کے لئے آئے۔ شاہ حبیب خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔

شاہ لطیف کے بچپن کے حالات پردہ تاریکی میں ہیں۔ لوگوں میں طرح طرح کے قصے کہانیاں اور کرامات مشہور ہیں جو شاہ کے بچپن کے زمانے سے منسوب کی جاتی ہیں۔ مگر ان میں سے اکثر واقعات تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں معلوم ہوتے۔ تاریخ تو ان واقعات کے بارے میں یکسر خاموش ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ باتیں صحیح بھی ہوں مگر شاہ کے عقیدت مندوں نے زیب داستان کے لئے ایسے ایسے حاشیے چڑھائے ہیں کہ اب تمام واقعات پر پردہ سا پڑ گیا ہے۔ اب تو ان کی شکل ایسی بدل گئی ہے کہ خد و خال بھی پہچانے نہیں جاتے۔ شاہ کے بچپن۔ تعلیم اور لڑکپن کے بارے میں قطعی طور پر کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔

کہتے ہیں کہ شاہ لطیف جب پانچ برس کے ہوگئے تو شاہ حبیب نے ان کی تعلیم کا اہتمام کیا۔ معلم آیا۔ اس نے شاہ کو الف بے پڑھانی شروع کی مگر شاہ لطیف الف سے آگے نہ پڑھے۔ ان کی دنیوی تعلیم یہیں ختم ہوگئی مگر شاہ کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی۔ شاہ کے کلام میں عربی اور فارسی کے سینکڑوں الفاظ ہیں۔ یہ دونوں زبانیں اس زمانے کے اہل علم لوگوں کی زبانیں تھیں جنھیں باقاعدہ درس و تدریس کے بغیر سیکھا نہیں جاسکتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ نے ان دونوں زبانوں کو نہایت باقاعدگی سے سیکھا اور ان میں مہارت حاصل کی۔ مگر یہ سب باتیں قیاسی ہیں۔ عقلی طور پر درست ہیں مگر تاریخی طور پر ان کی کہیں شہادت نہیں ملتی۔ کسی کو معلوم نہیں کہ شاہ نے کس زمانے میں تعلیم حاصل کی۔ ان کے استاد کون کون بزرگ تھے اور یہ تعلیم سندھ کے کس مدرسے میں ہوئی۔

شاہ لطیف بچپن ہی سے تنہائی کے رسیا تھے۔ کھیل کود اور شور و غل سے انھیں بڑی نفرت تھی۔ ان کے ہمجولی دن بھر کھیل کود میں مصروف رہتے مگر وہ کسی کونے میں بیٹھے نہایت سنجیدگی سے غور و فکر میں مصروف رہتے۔ ان کی آنکھیں خلاؤں میں لگی رہتیں اور وہ اپنے آپ میں ایسے گم ہوجاتے کہ بسا اوقات انھیں کھانے پینے کا بھی ہوش نہ رہتا۔ بچپن میں بھی بہت کم لوگوں نے انھیں باتیں کرتے یا ہنستے بولتے دیکھا۔ شاہ حبیب چاہتے تھے کہ شاہ لطیف بھی ان کے ساتھ عقیدت مند مریدوں سے ملاقات کریں۔ عقیدت مند مریدوں کی بھی یہی خواہش تھی مگر ایسے موقعوں پر شاہ لطیف کو ڈھونڈنا مشکل ہوجاتا۔ لوگ انھیں خانقاہوں۔ کھنڈروں اور حجروں میں ڈھونڈتے پھرتے مگر شاہ لطیف بڑے بڑے ہجوموں سے اجتناب کرتے تھے۔ وہ زیادہ تر درویشوں۔ صوفیوں اور فقیروں کی صحبت میں رہتے تھے۔ ان کے تیور بچپن ہی سے ان کے عظیم روحانی مستقبل کا پتہ دے رہے تھے۔

بچپن کا زمانہ انھوں نے اپنے والد شاہ حبیب کے ساتھ ہالا حویلی ہی میں گزارا۔ پھر شاہ حبیب کوٹڑی چلے گئے۔ شاہ لطیف نے بھی ہالا حویلی کو خیر باد کہا۔ شاہ لطیف اب بچپن سے لڑکپن میں داخل ہوچکے تھے۔ ان کے زہد اور پارسائی کا چرچا ہو رہا تھا۔ ان کی شاعری کا چمن بھی لہلہا رہا تھا۔ اس کی خوشبو پھیلنی شروع ہوگئی تھی مگر ابھی اس سے صرف کوٹڑی کا گرد و پیش معطر ہوا تھا۔ ابھی اس پھلواری میں ایسے پھول کھلنے تھے جنھوں نے بعد میں سندھ کے ذرے ذرے کو کیف و سرمستی کی فراوانی

سے نڈھال کردیا اور سندھی کافی کو رومی کی مثنوی اور عطار کی غزلوں کے مقابل لا کھڑا کیا۔

شاہ حبیب اپنے بچے کو جس سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے۔ شاہ لطیف کے رجحانات اس سے قطعی مختلف تھے۔ اس سے شاہ حبیب شروع میں پریشان بھی ہوئے۔ انھیں کیا علم تھا کہ ان کا بچہ جسے وہ محض باپ دادا کی گدی سنبھالنے کے لائق بنانا چاہتے ہیں ایسا نامور زاہد اور عظیم شاعر بننے والا ہے کہ اس کا وجود باپ دادا کے نام کو آب حیات پلائے گا۔ انھوں نے شاہ لطیف کو "سنبھالنے" اور انھیں راہ پر لانے کی بڑی کوششیں کیں۔ شاہ کو سمجھایا بجھایا مگر ان کی کوئی ترکیب کام نہ آئی اور شاہ لطیف عشق ازل میں گم رہے۔ آخر میں شاہ حبیب نے محسوس کرلیا کہ دریا کا رخ بدلا نہیں جاسکتا۔ دیوار سیلاب کو نہیں روک سکتی۔ پہاڑ مرکز سے نہیں ہل سکتے۔ بادل برسنے سے باز نہیں آ سکتے۔ وہ جان گئے کہ دریا کا کام بہنا ہے۔ بادل کی فطرت برسنا ہے۔ وہ جان گئے کہ پودا اپنی فطرت سے اگتا ہے۔ چنانچہ آخر میں زمین نے بیج کی فطرت کو سمجھ لیا اور اسے اپنی مرضی سے اگنے کے لئے چھوڑ دیا۔

شاہ عبداللطیف کی پیدائش کا زمانہ سندھ کی تاریخ کا اہم ترین موڑ ہے۔ شہنشاہ اورنگ زیب کی مہمات دکن نے مرکزی حکومت کی کمر توڑ دی تھی۔ گردش دوراں مغل شہنشاہ کی فراست اور سیاست سے تیز تر تھی۔ سلطنت کے بازوؤں میں اضمحلال پیدا تھا۔ سندھ میں کلہوڑہ خاندان کا اقتدار بڑھ رہا تھا۔ اگرچہ برائے نام وہ اب بھی سلطنت دہلی کے تابع تھے مگر یہ تابعداری عملی طور پر ایک طرح کا دکھاوا تھی۔ اورنگ زیب کی وفات کے وقت شاہ لطیف ۱۸ برس کے نوخیز نوجوان تھے۔ سلطنت مغلیہ کا انحطاط ان کی آنکھوں کے سامنے شروع ہوا۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے پورے بر عظیم پاکستان و ہند اور خصوصاً سندھ میں آئین حکومت بدل گیا اور وہ بساط الٹ گئی جسے بابر و اکبر نے اپنے خون سے جمایا تھا۔ بالا جی بالا راو ان کی آنکھوں کے سامنے دہلی پر چڑھا۔ نادر شاہ نے ان کے دیکھتے ہی دیکھتے دہلی کی گلیوں میں خون کی ندیاں بہائیں۔ احمد شاہ ابدالی بھی ان کے سامنے عقاب کی طرح شمال کے کالے پہاڑوں سے اترا اور مغربی پاکستان کے دشت و بیاباں پر گھوڑا دوڑاتا ہوا گذر گیا۔ ان کی زندگی میں دہلی کئی بار تاراج ہوئی۔ سندھ کئی بار خون سے لالہ زار ہوا اور مختلف قوموں کا باجگذار بنا۔ دریاوں میں طغیانی آئی۔ کھیتیاں سوکھ گئیں۔ لوگ بے گھر ہوئے۔ عورتیں بیوہ ہوئیں۔ بچے یتیم ہوئے۔ ظالموں نے اپنی تیغوں کو سان پر چڑھایا۔ مظلوموں کے گلے پکی ہوئی کھیتی کی طرح کٹ کٹ کر گرتے گئے۔ شاہ لطیف اس زمانے میں اپنے کمال پر تھے۔ اب ان کے تمام دنیاوی رشتے عملی طور پر کٹ چکے تھے۔ گھر اور گھر والوں سے ان کو کوئی واسطہ نہ رہا تھا۔ وہ کسی مادی مرکز سے منسلک نہ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے سچ کو ڈھونڈ لیا ہے۔ منزل معین کرلی ہے۔ راستے مقرر کرلئے ہیں ور اب حقیقی حسن کی طرف تیزی سے گامزن ہیں۔

شاہ لطیف کا رہن سہن۔ طرز گفتگو اس زمانے کے روایتی پیروں سے مختلف تھا۔ ان میں نہ وہ شاہی تھی نہ وہ جلال۔ وہ ہر ایک سے محبت اور نرمی سے گفتگو کرتے تھے۔

ہر ایک کا دکھ درد سنتے تھے۔ ہر ایک کو تسلی دیتے۔ اس کے حق میں دعا کرتے تھے جو بھی ان کے دوارے ایک بار چلا جاتا تھا۔ پھر کسی اور آستانے کا رخ نہ کرتا۔ شاہ کی مقبولیت مٹیاروں کے سیدوں کو بڑی ناگوار گذری۔ وہ ان سے جلنے لگے وہ شاہ لطیف کی عمر کو دیکھتے اور ان کی طرف کھنچتے ہوئے لوگوں کا سیل رواں دیکھتے تو تلملا اٹھتے۔ چنانچہ انھوں نے شاہ لطیف کو ستانا شروع کردیا۔ نور محمد کلہوڑہ جو سندہ کا سب سے قوی حاکم تھا۔ ان کے زیر اثر تھا۔ انھوں نے اسے شاہ کے خلاف بھڑکایا اور اسے سخت بد ظن کیا۔ مگر چند سال گذرنے کے بعد نور محمد کلہوڑہ پر حقیقت کھل گئی اور وہ ننگے پاوں شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شاہ لطیف اس سے بڑی شفقت سے پیش آئے۔ اس کے حق میں دعا کی۔ چنانچہ روایت ہے کہ غلام شاہ کلہوڑہ کی پیدائش شاہ لطیف کی دعا کا نتیجہ تھی۔

شاہ لطیف کی کافیاں سندہ کے شہروں اور دیہاتوں میں پھیل رہی تھیں۔ گھر میں عورتیں۔ گلیوں میں بچے اور کھیتوں میں کسان دیوانہ وار گاتے پھرتے تھے۔ رات کی تاریکی میں جب کوئی شاہ کی کافی کی تان اٹھاتا تو ذرہ ذرہ جھومنے لگتا۔ ایسے معلوم ہوتا کہ رات کی تاریکی ڈوب گئی ہے اور دن نکل آیا ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ سندہ کے دھڑکتے ہوئے دل نے شاہ کے پیغام محبت کو سمجھ لیا ہے۔ شاہ کا پیغام انتشار اور بد امنی کی کالی رات میں ایک شعاع نور تھا۔ شاہ اب زمین کے رشتوں سے قطعی طور پر آزاد ہوچکے تھے۔ انھوں نے کوٹڑی کو بھی خیر باد کہا اور ایک ویران اور سنسان ٹیلے پر آکے ڈیرا لگا دیا۔ یہ ویران اور سنسان ٹیلہ بعد میں بھٹ شاہ کہلایا۔ اور شاہ عبداللطیف اسی ٹیلے کی نسبت سے شاہ عبداللطیف بھٹائی کہلائے۔ بھٹ شاہ ان کے آنے سے قبل ایک غیر آباد ٹیلہ تھا مگر اس ٹیلے کے چاروں طرف روئیدگی تھی۔ یہاں بیری اور کھجور کے جھنڈ پھیلے ہوئے تھے۔ ہریل اور سندہی فاختائیں اپنے چہچہے سنا سناکے جنگل کو جگاتی تھیں۔ پاس ہی کرار جھیل تھی۔ جس کے کنارے سردیوں کے شروع میں قفقاز کی برفانی چوٹیوں سے آنے والی کالی کونجوں کی ڈاریں اترتیں اور سردیاں گذارکے اپنے ان جانے دیسوں کی طرف اڑ جاتی تھیں۔ یہاں فطرت کی تمام رعنائیاں پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر تھیں۔ دست انسان نے ابھی حسن فطرت سے ابھی اس کا طلسم چھینا نہیں تھا۔ یہ جگہ شاہ کے فقیر دل کو پسند آئی اور وہ یہیں بیٹھ گئے۔ شاہ کے جلو میں عقیدت مندوں کا ایک ہجوم تھا۔ انھوں نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک چھوٹی سی بستی کھڑی کردی۔ شاہ عبداللطیف نے ان کے ساتھ گارا بنایا۔ لکڑی چیری۔ دیواروں پر مٹی تھوپی--- یہ بستی آج تک موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گی۔ اس کی فضا میں شاہ کے نغموں کی شیرینی گھلی ہوئی ہے۔ اس کی ہواوں میں شاہ کے نفوس کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ شاہ نے اپنی عمر کا بقیہ حصہ یہیں گذارا۔ عمر بھر وہ یہیں سے محبت کے زمزمے سناتے رہے اور یہیں معرفت الٰہی کے نغمے گاتے ہوئے ایک دن وہ چپ چاپ سوگئے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی جوانی کے زمانے میں خوش شکل جوان تھے۔ ان کا قد درمیانہ۔ پیشانی کشادہ۔ ناک ستواں اور کالی سوچنے والی آنکھیں تھیں۔ بات بہت آہستگی سے کرتے تھے۔ راگ رنگ کے بے حد شوقین تھے۔ مثنوی مولانا روم اور قرآن پاک ہمیشہ بغل میں رکھتے تھے۔ ان کی زندگی خارجی حالات کے اثرات سے پاک رہی۔ خود ان کی زندگی میں کوئی بڑا واقعہ پیش نہ آیا۔ ان کا سارا کلام داخلی فکر اور مشاہدہ حق کی تصویر ہے۔ ان کے پورے کلام میں اس وقت کے خارجی انقلابات کے بارے میں ایک مصرعہ بھی نہیں ملتا۔ وہ وقت اور زمانہ کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے۔

حیاتِ جاوداں

علی مظہر رضوی

سندھ میں مغل اقتدار کے زوال اور کلہوڑہ خاندان کے حکمرانوں کے عروج کا تفصیلی تذکرہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے حالات زندگی کو بیان کئے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ سندھ کا عظیم المرتبہ صوفی شاعر مغلوں اور کلہوڑوں کے دور اقتدار کے درمیان حد فاصل بناتا ہے۔ شاہ عبداللطیف نے سندھ میں مغلیہ تسلط کو کمزور ہونے اور سندھ کو دلی کی مرکزی حکومت کے جوئے سے آزاد ہوتے دیکھا ہے ان کے زمانے کا تعین یقین کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن روایات کے مطابق سنہ ۱۶۸۹ ع سے ۱۷۵۲ع تک ہوتا ہے۔ آپ کا زمانہ حیات وہی ہے جب سندھ میں حکومت مغلوں کے ہاتھ سے نکل کر کلہوڑوں کے ہاتھ میں آئی۔ جب اورنگ زیب کا انتقال ہوا تو شاہ ۱۸ سال کے تھے۔ کلہوڑہ خاندان کا پہلا حکمران جب سندھ میں طاقت پکڑ رہا تھا تو آپ کی نوجوانی تھی۔ آپ پچاس سال کے تھے۔ جب نادر شاہ نے دلی کو لوٹا اور سندھ کو ایران کا باجگزار بنایا تو آپ ۸۵ سال کے تھے۔ جب احمد شاہ ابدالی نے دلی میں دم توڑتی مغلیہ حکومت پر حملہ کیا۔ موجودہ افغانستان کی بنیاد ڈالی اور سندھ کو کابل کی حکومت کے زیر نگیں کیا۔ اس کے پانچ سال بعد جب شاہ نے انتقال کیا تو سندھ میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے قدم جمانا شروع کردئے تھے۔ بظاہر شاہ ان سیاسی انقلابات سے بالکل بیگانہ سے رہے۔ شاہ نے درباری سازشوں اور ریاستی جنگوں میں کبھی کوئی دلچسپی نہیں لی اور نہ اپنی شاعری کو ان وقتی حادثات سے متاثر ہونے دیا۔ پھر بھی شاہ کا کلام اس دور کے سندھ اور سندھی عوام کی زندگی کا آئینہ وار ہے وہ ایک درویش تھا جس نے ہر شخص کے دکھ درد اور مسرت و انبساط کو اپنالیا تھا۔ وہ ایک صوفی تھا جو خالق اور مخلوق کے درمیان حائل پردوں کو اٹھا دینا چاہتا تھا۔ وہ ایک شاعر تھا جس کے نغمے الہامی تھے۔ جس کے گیتوں میں ماں کی ماستا اور محبوب کے پیار کی لذت تھی۔ شاہ کی شاعری اسلامی تصوف اور شعریت دونوں کا اعلیٰ امتزاج ہے۔ سندھ کا یہ عظیم المرتبت صوفی شاعر عہد وسطیٰ کے عظیم المرتبت شعرائے متاخرین میں سب سے ممتاز ہے۔

سندھ ایک اسلامی ریاست تھی۔ جس نے اٹھارہویں صدی میں نیم آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی اساس اسلامی مذہبیت پر رکھنا چاہی۔ سندھ میں ترویج اسلام اور مسلمانوں کے اقتدار کی تاریخ بے حد پیچیدہ اور گنجلک ہے جس کی بنا پر بڑے تعجب خیز نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ بر صغیر میں اسلام سندھ کے راستے داخل ہوا۔ لیکن سندھ میں اس کو پورے آٹھ سو سال کے بعد عمومیت حاصل ہوئی۔ اور اس وقت تک مسلمان عقائد اور رسومات کی بنا پر مختلف گروہوں میں تقسیم ہوچکے تھے۔ سندھ میں مذہبی عقائد کی قیادت چار گھروں میں بٹی ہوئی تھی۔

(۱) سید (۲)قریشی یا صدیقی (۳) علوی اور (۴) عباسی ان میں سید سب سے زیادہ با اثر تھے۔ عوام میں توہم پرستی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ پیروں کو جو عام طور سے سید ہوتے تھے ان کو معاشرے میں ہندو دیوتاوں جیسا مرتبہ حاصل تھا۔ تمام صوبوں میں پیروں اور سیدوں کی درگاہوں اور گدیوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ غیر مسلموں کی توہم پرستی پیروں کی سرپرستی میں پھل پھول رہی تھی۔ دراصل یہ زمانہ اسلامی عقائد کے زوال کا زمانہ تھا یہ شاہ عبداللطیف کی بلند آہنگ شخصیت تھی کہ انھوں نے ایسے زمانہ میں اسلام کے اعلیٰ پیغام کو تصوف اور شعریت میں ڈھال کر لوگوں کے دلوں میں نقش کردیا۔

شاہ کی زندگی کے مستند حالات دستیاب نہیں ہیں۔ شاہ کے متعلق تمام معلومات روایات کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں۔ گزشتہ صدی کے آخر تک ایسے لوگ زندہ تھے جنھوں نے شاہ کے حالات زندگی اپنے دادا سے سنے تھے۔ ان سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی روایات کو عقیدتمندی نے کہیں سے کہیں پہونچادیا ہے۔ بہرحال شاہ کے موجودہ تمام تذکروں میں مرزا قلیچ بیگ کا لکھا ہوا تذکرہ سب سے زیادہ مستند ہے۔ شاہ کی ولادت اور وفات کی تاریخوں کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ روایات کے مطابق شاہ عبداللطیف سنہ ۱۶۸۹ع میں حیدر آباد سندھ کے ایک گاوں ہالا حویلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا پورا نام شاہ عبداللطیف بن سید حبیب بن سید عبدالقدوس بن سید جمال بن سید شاہ کریم ہے۔ آپ کا تعلق مٹیاری کے علوی سیدوں کے گھرانے سے تھا۔ اور یہ سلسلہ نسب ہرات کے سیدوں سے جا ملتا ہے۔ آپ کی زندگی کے شروع سال ہالا حویلی میں گزرے۔ کچھ دنوں بعد آپ کے والد کوٹری میں آباد ہوگئے وہیں آپ سن بلوغیت کو پہنچے۔ شاہ عبداللطیف کے اطوار شروع ہی سے سندھ کے عام سید زادوں سے جدا گانہ تھے۔ سیدوں کے با اثر خاندان اور دنیاوی جاہ و حشم دسترس ہونے کے باوجود شاہ نے جوانی ہی سے بے نیازی کی زندگی بسر کی۔ آپ کی طبیعت میں نیکی اور رحم کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ بات چیت میں نرمی اور شیرینی اور ذاتی معاملات میں عجز و انکسار آپ کی فطرت تھی۔ ابتدائی زندگی سے آپ کا رجحان تصوف کی طرف تھا۔ آپ کا بیشتر وقت یا تو صوفی منش بزرگوں کی صحبت میں گزرتا تھا۔ یا پھر تنہا ذکر و فکر میں۔ آپ کو اس دور کے دوسرے صوفیائے کرام اور اکلیاء اللہ کی طرح سیر و سیاحت کا بے حد شوق تھا۔ زندگی اور مذہب سے براہ راست تعلق پیدا کرنے کی لگن میں آپ تمام سندھ اور اس کے قرب و جوار کے علاقوں مثلاً ملتان۔ جیسلمیر۔

کچھ- کاٹھیاواڑ- لسبیلہ اور مکران وغیرہ کا دورہ کیا- ان میں سے اکثر جگہوں پر شاہ ہندو سادھوؤں- سنیاسیوں اور بزرگوں کے ساتھ رہے- ان سیاحتوں میں شاہ عبداللطیف نے ہر طبقہ کے لوگوں کی زندگی کا براہ راست مطالعہ کیا- غریب دیہاتیوں- کاریگروں کسانوں اور گلہ بانوں کی زندگی کا کوئی راز ان سے پوشیدہ نہیں رہا- ہندو اور مسلمان مذہبی شخصیتوں کی صحبت اور ان کے مطالعہ نے شاہ پر مذہبی رسومات کے کھوکھلے پن کو واضح کردیا- اور آپ اس نتیجہ پر پہنچے کہ خالق اور مخلوق کی محبت سے عظیم کوئی طاقت نہیں اور یہی اصل مذہب ہے- زندگی کے ہمہ گیر مشاہدے نے آپ کی شاعری میں لامحدود وسعت پیدا کردی-

شاہ عبداللطیف کے سادہ اور پرخلوص اطوار اور حسن اخلاق کے ساتھ ساتھ ان کی پرکیف شاعری نے لوگوں کو آپ کے حلقہ ارادت میں شامل کرانا شروع کردیا تھا- لیکن اور زیادہ موثر اور ہمہ گیر تقلید کے لئے شاہ نے ایک نئی اور آزاد فضا کی ضرورت محسوس کی- لہذا شاہ نے کوٹڑی سے نکل کر اپنے لئے ایک نئے گاوں کی بنیاد رکھی جس کو بھٹ یعنی ریت کا ٹیلہ کہتے ہیں- شاہ نے اپنی عمر کا بقیہ حصہ یہیں بسر کیا- یہیں ان کی شاعری اور تصوف معراج کمال کو پہونچے- زندگی کے آخری دور میں ایک بڑی تعداد آپ کی روحانیت اور ولایت کی قائل ہوچکی تھی- آپ کی شاعری کے دلدادہ ہر وقت ہجوم کئے رہتے تھے- سنہ ۱۷۵۲ع میں آپ نے انتقال کیا- غلام شاہ کلہوڑہ والئی سندہ نے سنہ ۱۷۵۴ع میں آپکا مزار تعمیر کرایا- جہاں ہر جمعہ کو آپ کے عقیدتمندوں کا مجمع ہوتا ہے- لوگ ٹولیوں میں آپ کے لوک گیت- کہانیاں- دوہے اور خیال گاتے ہیں اور سر دھنتے ہیں-

شاہ عبداللطیف سندہ کے تمام بڑے شاعروں میں الوہیت کا درجہ رکھتے ہیں- شاہ نے شاعری کے میدان میں عربی اور فارسی کے زوال پذیر اثر کو ایسے زمانہ میں قبول کرنے سے انکار کردیا- جب کہ سندہ اپنی پوری طرح سے عہد متوسط کے دور سے نکل نہیں سکا تھا- شاہ کی شاعری کا ایک اپنا انداز ہے جس کو اپنانا دوسروں کے لئے مشکل ہی نہیں ناممکن ہے- شاہ رومی سے متاثر نظر آتا ہے لیکن اس نے کہیں بھی رومی- حافظ یا بسطانی کی نقل نہیں کی وہ ایک ایسا شاعر تھا- جس نے پہلی بار انتہائی چابکدستی سے عوام کی زبان استعمال کی اور اس کے ذریعہ حسن اور مذہبی فلسفہ کی ترجمانی کی اس نے فارسی شاعری سے فائدہ ضرور اٹھایا لیکن مقامی رنگ اور زبان کی خوبیوں کو برقرار رکھا- شاہ نے ایک حقیقی شاعر کی طرح نغمات کے ذریعہ اپنے جذبات و خیالات اور افکار کی صحیح ترجمانی کی ہے- شاہ بنیادی طور پر ایک صوفی شاعر---- ہے لیکن اس کی شاعری میں تصوف اور شعریت دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہیں- شاہ کے کلام میں ہر جگہ تصوف ہے اور ہر جگہ شعریت- شاہ کی شاعری کا بیشتر حصہ عشقیہ داستانوں پر مبنی ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ داستانیں عام طور سے اس کے پڑھنے والوں کو معلوم ہیں اس لئے وہ اپنے نغموں میں محض ان لمحات- ان جذبات اور ان اقدار کو نظم کرتا ہے جن سے وہ ایک خاص ماحول اور اثر پیدا کرنا چاہتا ہو- یہی وجہ ہے کہ انسان کے مختلف

محسوسات کے ذکر کے ساتھ ساتھ وہ ٹھوس حقائق اور دائمی اقدار کو بڑی فنکاری سے نظم کرتا ہے۔ شاہ ایک خاص نظریہ حیات کا حامل ہے اور اس نے اپنی شاعری میں ہر جگہ اسے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاہ اپنی شاعری کی اس خصوصیت سے پوری طرح واقف ہے۔ اس نے کہا ہے:

"جسے تم دوہے (بیت) سمجھتے ہو وہ درحقیقت (دانشمندی کے) راہ نما ہیں
جو تم کو تمھاری منزل تک لے جاسکتے ہیں"۔

زندگی کے متعلق شاہ کا فلسفہ بہت ہی واضح اور سادہ ہے۔ عام صوفیاء کی طرح وہ حیات کو بے ثبات تو مانتا ہے لیکن اس کا زاویہ نگاہ منفی نہیں ہے بلکہ مثبت ہے۔

"محبوب کے پہلو میں زندگی بسر کرنے کے لئے جان دیدو۔
جان دیکر ہی دوست کو پاؤگے"۔

شاہ کے نزدیک موت مقصد حیات حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ عدم دراصل وجود ہی کا دوسرا رخ ہے۔

محبوب کے حسن سے لطف اندوز ہونے کے لئے مر کر زندہ رہو۔
اگر تم نے اس مشورے پر عمل کیا تو عظمت حاصل کروگے۔

موت قبل از موت کے منفی نظریہ کو شاہ عبداللطیف نے مثبت میں تبدیل کردیا ہے۔

عوامی شاعر

غلام مصطفےٰ قاسمی

Scanned with CamScanner

سر زمین سندھ کے بلند پایہ شاعر اکمل عارف بھٹ دھنی کے علمی ادبی اخلاقی اور سیاسی گلشن "رسالہ" کے شمیم معطر کی وصف و ثنا کیا کی جائے۔ اس کے ایک ایک باب کا ہر ایک شعر لامتناہی اسرار اور بے حد خوبیوں کا حامل ہے۔

کسی شعر کے معیاری ہونے کیلئے اس میں دو باتوں کا خصوصی طور پر خیال کیا جاتا ہے۔-

(۱) ایک تو الفاظ شیریں۔ موزوں اور مناسب لائے جائیں جن کے ذریعہ سامعین کو آسانی سے اپنے دلی جذبات اور کیفیات سے متاثر کیا جاسکے۔

(۲) دوسرے ایک عوامی ادیب کیلئے خیالات کی بلندی بھی لازمی شئے ہے۔

بھٹائی صاحب کے کلام میں جسطرح الفاظ عمدہ اور بے نظیر ہیں اسی طرح اس میں خیالات بھی عمیق اور ہمہ گیر ہیں۔ دو تین مثالیں پیش کرتے ہوئے اپنے مقصد کی طرف آجاونگا۔ حق کی راہ میں قربان ہونا اور سر کا تن سے جدا ہونا عاشقان الہی اور مجاہدین کا معمول ہے۔ ایک تاتاری سپاہی نے جب خواجہ کمال الدین اصفہانی کو خنجر سے زخمی کیا جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے۔ مرتے وقت اپنے ہی خون سے اپنے گھر کے در و دیوار پر مندرجہ ذیل رباعی لکھکر جان بحق ہوگئے۔-

رباعی!

دل خون شد شرط جانگدازی این است — در حضرت او کمینہ بازی این است
با ایں ہمہ خود ہیچ نمی یارم گفت — شاید کہ مگر بندہ نوازی این است

جب شیخ عطار کو ایک تاتاری نے قتل کیلئے بٹھایا تو فی البدیہہ آپ نے یہ رباعی پڑھی۔-

رباعی!

دلدار بہ تیغ برد دست اے دل بین — بربند میان و بر سر و پابنشین
وانگہ بزبان حال مے گو کہ بنوش — جام از کف یار شربت بازپسین

جب سر تن سے جدا ہونے لگا تو آپنے فرمایا۔-

در راہ رسم تو سرفرازی این است — عشاق ترا کمینہ بازی این است
با این ہمہ از لطف تو نومید نیم — شاید کہ ترا بندہ نوازی این است

اب آئیے بھٹائی صاحب کی طرف کہ وہ عشق حقیقی کی راہ میں کتنے شیریں الفاظ میں دوسروں کو بھی قربان ہونے اور دار پر چڑھنے کی دعوت دے رہے ہیں۔

سوريءَ سڏ ٿيو، ڪا هلندي جيڏيون

وڃڻ تن پيو نالو نيهن ڳنهن جي،

سوري سڏ ڪري اِيي عاشقن کي،

جي اٿيئي سڌ سڪڻ ۾ ته ڪر م پير پري،

سسي ڌار ڌڙي پڇج پوءِ پريتڙو.

سوري آهه سينگار اصل عاشقن جو،

مڙڻ موٽڻ ميهڻو، ٿيا نظاري نِروار،

ڪسڻ جو قرار اصل عاشقن جو.

یعنی دار اور سولی پر چڑھنے کی دعوت دی جارہی ہے۔ میرے ساتھ اگر کسی کو چلنا ہے تو چلے دار پر جانا تو ان لوگوں کا کام ہے جو محبت کا نام لیتے ہیں۔ سولی (بذات خود) عاشقوں کو اپنی طرف بلا رہی ہے۔ اے مخاطب اگر تم عشق و محبت کے مدعی اور طالب ہو تو پیچھے مت ہٹو۔ پہلے سر تن سے الگ رکھو پھر محبت کا نام لو۔

سولی اور دار تو درحقیقت عاشقوں کیلئے باعث زیب و زینت اور ہار ہے۔ ہچکچانا یا پیچھے ہٹنا تو ان کیلئے ایک عتاب ہے وہ تو برملا منظر (دار پر) آتے ہیں۔ عشق و محبت کی راہ و رسم میں قربان ہونا اور سر کا تن سے جدا ہونا عاشقوں کا (ادنی کرشمہ) اور انکی زندگی کا جزو لاینفک ہے۔

بھٹائی صاحب کے رسالہ یا کلام کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ اس کی تدوین و ترتیب اور مختلف مطبوعہ و غیر مطبوعہ نسخوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ کرکے اصل کلام کی تحقیق اور جستجو کی جائے اور مشکل الفاظ کے معانی لکھے جائیں۔ اس پر صوبہ کی زبان سندھی میں پہلے ہی بہت کچھ لکھا گیا ہے تاہم ایک مستند اور تحقیق شدہ نسخہ کی تیاری کیلئے سندھی ادبی بورڈ کی جانب سے جو معقول اہتمام کیا گیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ یقینی طور پر ایسے آثار نظر آرہے ہیں کہ شاہ کے کلام کا یہ پہلو درجہ تکمیل کو پہونچ جائیگا۔ لیکن شاہ کے کلام کا دوسرا رخ جو کہ کلام کے اسرار مقاصد اور مطالب سے تعلق رکھتا ہے وہ ابھی تک تشنہ تکمیل ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ شاہ کا کلام ایسا ہمہ گیر اور جامع ہے کہ جسطرح تصوف اور فلسفہ اسلام کے اسرار اس سے مستنبط کئے جاسکتے ہیں۔ بالکل اسی طرح ہمارے روزمرہ کے ملکی مسائل کا حل بھی اسی میں موجود ہے۔ فقط اس امر کی ضرورت ہے کہ کلام کا عمیق مطالعہ کرکے استنباط کی کوشش کی جائے۔ اس سلسلہ میں ہمارے نوجوان اور ادیبوں نے کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ لیکن اب بحمداللہ وقت کی پکار کو لبیک کہکر قومی اور ملکی درد رکھنے والے چند ادباء میدان میں اترے ہیں۔ اس سلسلہ میں جناب سید غلام مرتضی شاہ صاحب کی تازہ شائع شدہ کتاب "پیغام لطیف" پہلی کوشش ہے۔ فی الحقیقت شاہ کے کلام کا یہ رخ کبھی درجہ تکمیل کو نہیں پہونچیگا۔ کیونکہ ہر دور کے حالات نرالے ہوتے ہیں اور ان کے پیچیدہ مسائل کے حل کرنے کا طریقہ کار بھی الگ
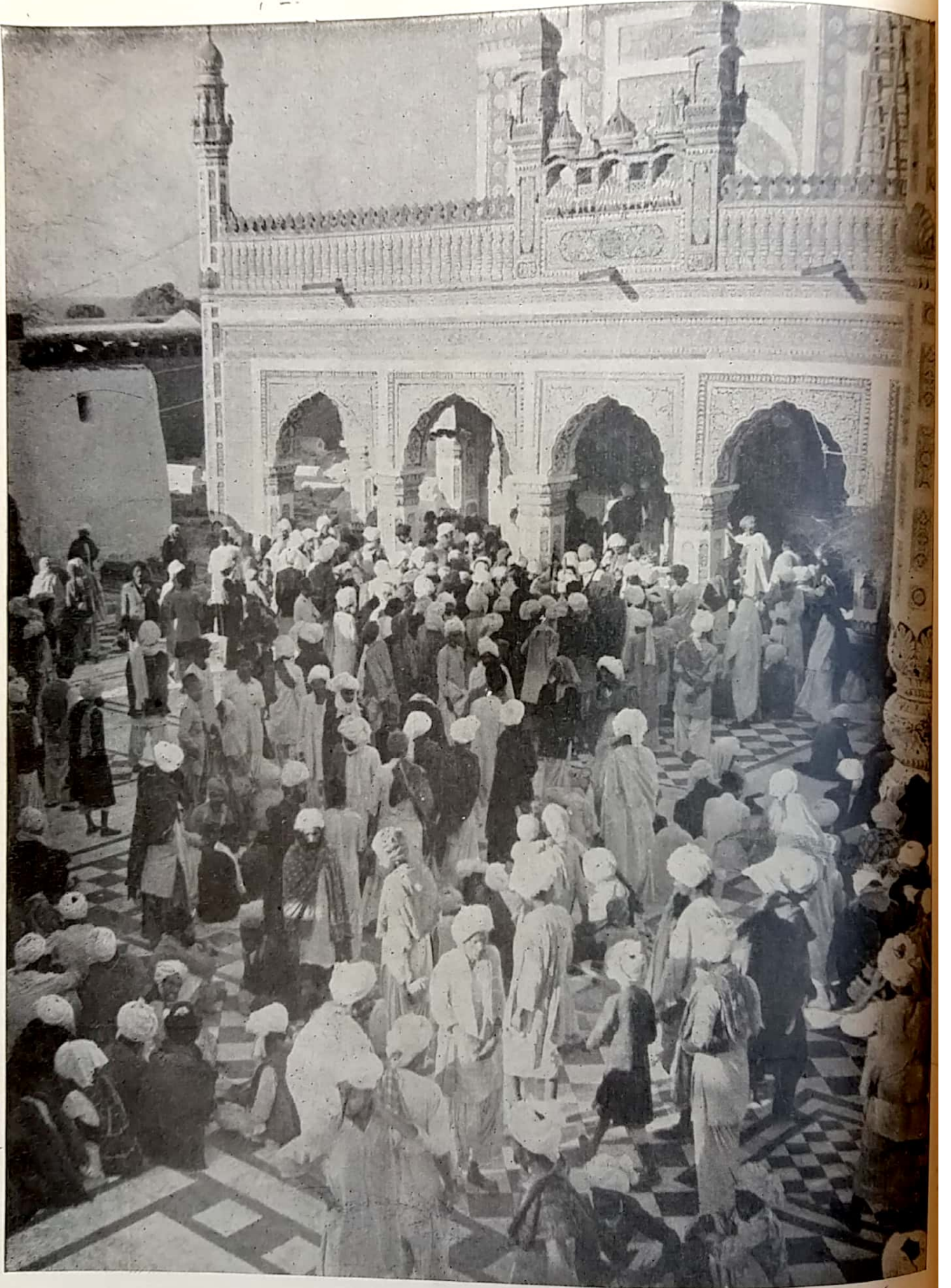
محفلِ سماع کا ایک اور منظر۔ لوگوں کا ذوق و شوق قابل دید ہے

ہوتا ہے۔ میرے خیال میں بھٹائی صاحب کا کلام افادی نقطہ نظر سے ایسا ہمہ گیر ہے کہ ہر دور کے نئے تقاضوں اور حالات سے برابر مطابقت پاتا رہیگا۔ اس وقت جو اہم مسائل ہمارے سامنے ہیں۔ میں یہاں ان کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ لیکن میری ناقص رائے میں اس میدان کو سر کرنے کیلئے شاہ بھٹائی جیسے عوامی ادیب کے کلام میں ہمیں بنیادی خیالات مل سکتے ہیں۔

ہمیشہ سے فطرت کا یہ اٹل دستور رہا ہے کہ دنیا میں کوئی بھی تحریک جسکی بنیاد حکمت اور فلسفہ پر نہیں ہوتی وہ پائیدار نہیں ہوتی۔

روس کی بڑھتی ہوئی تحریک پر نظر کیجئیے تو آپکو معلوم ہوگا کہ اسکی بنیاد کارل مارکس کے مادی فلسفہ پر مبنی ہے۔ ہم چونکہ مابعدالطبعیات پر بھی ایمان رکھتے ہیں اسلئے ہمارے لئے مادی فلسفہ کے ساتھہ الہیات کا جاننا بھی اشد ضروری ہے۔ اس کیلئے "رسالہ شاہ" کے پہلے دو باب "کلیان اور ایمن کلیان" کا مطالعہ کافی ہے۔ لیکن ان دو ابواب کو سمجھنے کیلئے شاہ بھٹائی کے راز دار رفیق مخدوم محمد معین ٹھٹھوی کے شیخ شاہ ولی اللہ دہلوی کا فلسفہ پڑھنا بھی ضروری ہے۔ جب ان دو ہمعصر اور ہم خیال بزرگوں کے کلام اور فلسفہ کو سمجھا جائیگا تو ان دونوں بزرگوں کے افکار اور فلسفہ سے چند بنیادی اصول لیکر اپنے معاشرہ کی بہبودی اور برتری کیلئے ان کو اساس بنایا جاسکیگا۔

وطن کے حدود کا مسئلہ تو آپکو رسالہ کے ہر ایک باب میں ملیگا۔ مارئی کا باب حب الوطنی کیلئے وقف ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہئیے کہ کسی قوم یا سوسائٹی کی ترقی کا راز عوام کی خوشحالی میں مضمر ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی لکھتے ہیں کہ اگر کوئی سوسائٹی ایسی ہے جس کے سرمایہ اور دھن دولت پر چند مخصوص لوگوں کا (ناجائز) قبضہ ہے۔ وہ سوسائٹی ایک مرد بیمار کا درجہ رکھتی ہے۔ بھٹائی صاحب چونکہ حکیم الہند شاہ ولی اللہ دہلوی کے ہمعصر اور ہم خیال بزرگ تھے اور یہاں کے عوام کی بہتری کے خواہاں تھے۔ اسی جذبہ کی بنا پر ان کو یہ دعائیہ بیت کہنا پڑا۔

"سائينم سدائين ڪرين مٿي سنڌ سڪار،
دوست تون دلدار عالم سڀ آباد ڪرين ."

انھوں نے سندھ کے دیہاتی منظر کو پیش کیا اور دیہات کو ہی اپنی اقامت گاہ بناکر عوام سے میل جول۔ ربط ضبط قائم کرتے رہے اور آپکے کلام میں عوام کے ساتھہ ان کے سادہ مناظر جنگلات اور تالابوں کا بھی ذکر موجود ہے۔ ایک باب میں فرماتے ہیں:-

ڪرڪي ڳالهڙيون ڪندا! ٻور ڏٺين جون،
ڪيئن سي راتڙيون ڪيئن هنيرڏينهن گذارئين،
ڪر ڪا ويهي ڳالهه ڪندا! ٻور ڏٺين جي،
ههڙي اڄ حال ڏکيا ڏينهن گذارئين.

یہاں بظاہر تو جنگل کے درختوں اور تالابوں سے خطاب ہے لیکن کنایتاً آبادگار مراد ہیں جنکی ان جگھوں میں بود و باش ہوتی ہے۔

عربوں کی زندگی بدویانہ رہی ہے- اگر آج ایک جگہ تو کل وہاں سے غائب- اسلئے عرب شعراء کا بھی یہی دستور رہا ہے کہ اپنے تمثیلات اور تشبیہات میں ریگستان کے قدرتی مناظر کو پیش کرتے ہیں- کسی جگہ پہونچکر اپنے محبوب کے آستان کو یاد کرتے ہوئے بے ساختہ آہ و بکا شروع کرتے ہیں- دور جاہلیت کے فصیح و بلیغ شاعر ملک الشعراء امراوالقیس کے مندرجہ دوبیت ملاحظہ فرمائیے۰-

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل
بسقط اللوی بین ادخول فحومل
فتوضح والمقراۃ لم یعف رسمہا
لما نسجتہا من جنوب و شمال

بھٹائی صاحب نے مذکورہ باب میں آگے چلکر مگرمچھ کو اسطرح خطاب کیا ہے۰-

مٿو آهين مڇ ٿلهو ٿيو ٿونا هڻين ،
جا لو ڏني اڄ تنهن پاڻيءَ پنا ڏينهڙا .

جب دریا زوروں پر تھا تو وہ وہاں سے نکل کر ایک کھڈ میں آگیا تھا- جب تک دریا شباب پر رہا مگرمچھ کو اپنے استھان پر واپس آنا آسان تھا- لیکن جب اچانک پانی کم ہوگیا تو دریا کی طرف جانے کا راستہ نہ رہا اور جب کھڈ کا پانی بھی سوکھ گیا تو لوگوں نے اس کو ختم کردیا- یہ حال بیان کرنے کے بعد شاہ صاحب پھر اس مگرمچھ سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "تم اپنے سے کمزوروں کو کھاکر موٹے بنے ہو اور (غرور و تکبر سے) دوسروں کو ستانے کی کوشش میں ہو لیکن جس سیلاب پر تم اس وقت تکیہ کئے ہو وہ اب ختم ہورہا ہے اور تمھارا حشر برا ہوگا"-

جب ملک میں خوشحالی کا دور دورہ ہوتا ہے تو شکست خوردہ طاغوتی طاقتیں ملک میں انتشار اور اختلاف پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں اسلئے عوام اور ان کے زعماء و قائدین کا اتحاد اور میل ملاپ نہایت ضروری ہے- اتفاق کے بغیر وہ خوشحالی برقرار نہیں رہ سکتی- اسلئے آگے چلکر کونج نامی پرندوں کا آپس میں اتفاق اور محبت کی مثال (جو کہ ضرب المثل ہے) بیان فرماکر اتحاد اور تنظیم کی تلقین فرماتے ہیں۰-

روہ روماڻا ڪن، اڄ پڻ هلڻ هاريون ،
ڪرڱل ڪونجڙين، رائي ۾ رات ڪئي .
وڳر ڪيو وتن ، پرت نہ ڇنن پاڻ ۾ ،
پسو پکيڙن، ماڙهنئا ميت گهڻو .

ان ابیات میں اتفاق اور اتحاد کیلئے کتنا اچھا سبق ہے کہ (پرندے) آپس میں اسطرح محبت سے رہتی ہیں کہ ایک دوسری سے الگ نہیں ہوتیں اور قطاریں بنائے چلتی ہیں- (اگر خدانخواستہ ان میں سے کوئی بچھڑ جاتی ہے تو سب اس کی تلاش میں لگ جاتی ہیں) شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ دیکھئے پرندوں میں انسانوں سے زیادہ محبت اور ملاپ ہے- اس خیال کو نظم کرنے کا مطلب یہ تھا کہ شاہ صاحب عوام کو اتحاد کے فوائد سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں- ان کے خیال میں زندگی کی کامیابی اور قوموں کی خوشحالی کا راز اسی اتحاد میں مضمر ہے- شاہ صاحب کے ارشاد کو ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے لیکن آج بھی ہمارے سامنے وقت کا سب سے اہم مسئلہ یہی ہے کہ اس کے تنافر کو کس طرح دور کیا جائے- کاش! لوگ اب بھی شاہ صاحب کے ان خیالات سے سبق حاصل کریں-

رفیق خاور

شہاب رفعت

ابن انشا

جمیل نقوی

لطف اللہ بدوی

شاہ عبداللطیفؒ

سوہنی مہار

مترجمہ
رفیق خاور
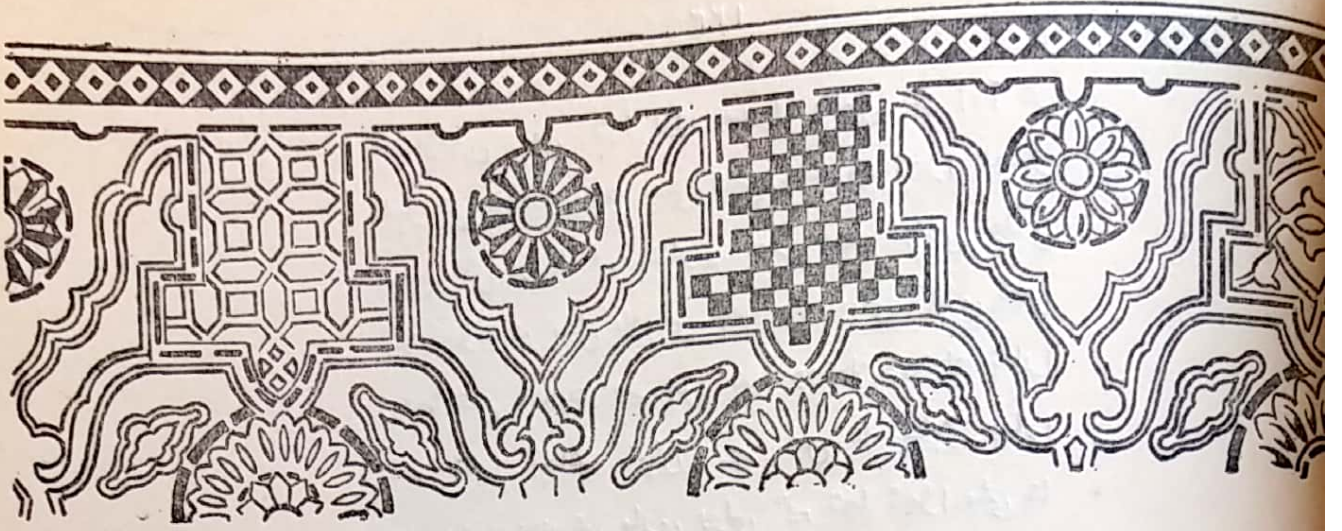
(۱)

کھڑی ہوئی دریا کے کنارے ناریاں شور مچائیں
"ہائے ساہڑ![1] ہائے ساہڑ! تجھ تک کیسے آئیں؟"
کچھ ایسی ہیں جو اپنے ہی غم میں ہیں کھوئی کھوئی
"کیسے کودکے جان گنوائیں؟" یہ کہتی ہیں کوئی
ہاں لیکن ساہڑ ہے اسی کا جو طوفان بلا میں
اپنی جان کو جان نہ جانیں۔ کود پڑے دریا میں

ایسی ہی الفت کی ماری سوہنی تھی متوالی
جس نے ساتھ گھڑے کے اپنی جاں منجدھار میں ڈالی
اجلی باہوں پر اٹھی تھیں بل کھاتی ہوئی موجیں
اور چلی جاتی تھی پکارے وہ بے بس چنتا میں
"پیارے ساہڑ! دلبر جانی! آجا۔ واپس آجا
تیرے باعث رشک کناں ہے مجھ پہ زمانہ سارا"

۱۔ سوہنی کے محبوب مہیں وال کا چہیتا نام۔

جھاڑیوں میں تھا لیا بسیرا بگلوں نے آ آ کر
ظہر کی ساعت بیت چکی تھی جب وہ گھڑا اٹھاکر
پہنچ گئی دریا کے کنارے اور پھر جلدی جلدی
ڈالا گھڑے کو سیل بلا میں جب مغرب کی گھڑی تھی
دیکھا کس حسرت سے اس نے دھندلا دھندلا کنارا
تاکہ نظر آجائے کہاں ہے اس کا ساہڑ پیارا
پھر وہ پریت کی ماری بولی "یہ تھا گھڑا مٹی کا
جس میں دیکھا میں نے اپنے مہیں وال کا مکھڑا
یہ ٹوٹے تو جیون ٹوٹے- یہ ڈوبا- دل ڈوبا!"
پھر بھی نہ ہو نومید کرم سے حق کا یہی فرماں ہے
اسی کو اپنی ناو بنالے- اسی میں تیری اماں ہے
پھر اس کیف سے جس سے مست ہوں جلوہ حق کے رسیا
تو بھی دیکھ سکے گی اپنے مہیں وال کا مکھڑا

ٹوٹ چکا جب گھڑا بھنور میں- جان لبوں پر آئی
موجوں کے چنگل سے باقی رہی نہ شکل رہائی
سوہنی کے کانوں میں آئے بول مہیں پیارے کے
"پار نہ آ تو اپنے بل پر- راہ سلامت تج دے
تند اور طوفانی موجوں میں عشق بنے گا کھیون ہار
جن کی محبت کشتی راں ہو- ترت ہے انکا بیڑا پار
چھوڑ دے اپنی سب تدبیریں- بے سامان سفر چل دے
توڑ بھی دے اس خام گڑھے کو- کردے اسکے ٹکڑے

اس دریائے بے پایاں میں جسکی کوئی تھاہ نہیں ہے
عشق کا دامن تھام لے جس سا کوئی خضر راہ نہیں ہے
ایک تیرا مہیں وال ہی ان کی خیر خبر کا جویا ہے
جن کا تن من اسکی ہوائے شوق میں یکسر کھویا ہے
جن کے دل میں عشق ہی عشق ہو اور کسی کو کیا جانیں
جن کو محبت کا ہو سہارا ناو کا دام بلا جانیں"

(۲)

چلاتی ہیں- بل کھاتی ہیں- ہیبت ناک بھبکتی موجیں
پالتی ہیں جو سیکڑوں تند اور تیز مگر مچھ پہلو میں
لاکھوں ہزاروں- ہیبت پرور- کیسی بلائیں- کیا کہئے
او ساہڑ! او ساہڑ! میرا جوڑ بھلا ہو کیا ان سے؟
جب تک تو نہ مدد کو آئے- اور نہ سہارا دے مجھ کو
آو لپک کر میری مدد کو- تم جو خدا کی رحمت ہو

چڑھے ہوئے دریا کی دہشت- اسکا ہیبت زا غوغا
وہ گرداب جو غراتے ہیں پھاڑکے کلے ہوشربا
گھورتی موجیں تاب بھلا کیا لائے ان کی تن میرا
پر ہیبت- پھنکارتی موجیں- ایک قیامت کا غوغا!
دریا میں اک شور مچا ہے- جاں لیوا رفتار اسکی
ساہڑ- میرے دل کا مالک- کاش سنے فریاد مری!
کاش مری آواز کو سن لے- میری فغاں مہیں وال مرا
ساہڑ گر تو سن لے اسکو پھر کیا خوف ہے طوفاں کا
دریا میں اک شور بپا ہے- گھومتے ہیں خونخوار درندے
موذی آدم خور ہیں ہر سو کلے پھاڑے لوٹتے پھرتے
کتنے بیڑے غرق ہوئے ہیں- لاتعداد- عظیم الشاں
اک تنکا بھی نہیں ہے باقی ایسے ہوئے بے نام و نشاں
لوٹتی موجوں کے پہلو میں دیو ہیں ہیبت ناک کوئی
کیونکہ سفینے گم ہو ہو کر واپس آتے نہیں کبھی
ساہڑ! آکر تھام لے انکو- لے جا دریا کے اس پار
چڑھے ہوئے دریا میں جو ہیں تیرنے سے لاچار

(۳)

سید- ترچھا کنارا جس سے سوہنی دریا میں در آئی
اس کی نحوست اپنے جلو میں گرچہ قیامت لائی
پھر بھی وہ اس کے حق میں نکلا ملجا امن و اماں کا
چلتی گئی گردابوں کے اندر وہ محفوظ سراپا

آنکھیں تھیں بھر پور محبت کے جلووں سے نورانی
حق یہ ہے۔ حق اسکا ہے جسنے جہد کی قدر ہو پہچانی
اس نے طلب کی اپنے حق کی۔ اس سچ مچ کی سوہنی نے
جب تک قدر و قضا کی موجیں لے نہ گئیں اس پار اسے
نا کوئی مانجھی نا کوئی نیا نا کوئی رسی تن سے بندھی
کچے گھڑے پر تیرتی تیرتی دریا کے اس پار گئی
سوہنی سیکھ لے راز فطرت کیسے چپکے ہی چپکے
ہوتا ہے پورا عدل کا منشا پر اسرار طریقوں سے
سچ تو یہ ہے عرفان حقیقت اہل محبت کی جاں ہے
اس طوفان حوادث میں یہ حاصل دین و ایماں ہے
(۱)
سوہنی کی بے تات طبیعت دم نے بہتیری روکی
پند و نصیحت۔ طعن ملامت۔ شام و سحر رہتی جاری
پھر بھی اس منجدھار میں اس نے منہ نہ سوئے ساحل موڑا
ساہڑ سے جو عہد کیا تھا اس کو نہ جیتے جی توڑا
لاکھ اٹھیں طوفان مگر وہ سوہنی کو کیا روک سکیں
فرق نہ تھا کچھ پائوں اٹھانے۔ دریا پار اترنے میں
کیا ہی کہے گی اترا کر وہ مائی بپتا کی ماری
جسکی بیٹی کی قسمت میں تھی ایسی افتاد لکھی
سوہنی! گر تو جانتی ہے کیا چیز ہے عشق کی بے تابی
اس کا یقیں رکھ تو محبوب کو اپنی طرف لے آئے گی

سوہنی۔ اے بہتے شہتیر! مرا دمساز۔ مرا ساتھی بن جا
پھر میں بتاونگی تجھکو مرے دلمیں بھرے افکار ہیں کیا
یہ کہ اگر ہر چار طرف مینہ موسلا دھار برستا ہو
دنرات بندھی ہو اک جھڑی جل تھل کا عالم برپا ہو
میں ساون کی بھیگی رت کو اک سوکھا جاڑا جانوں گی
اور اپنے دوست کے دریا کو پھیلا ہوا صحرا جانوں گی
کیوں؟ اسلئے جب دریا کے ادھر محبوب کھڑا رخ دیکھتا ہو
طوفان میں بھی اس پار پہنچنا لازم ہے۔ چاہے کیا ہو

(۱) سوہنی کا شوہر۔

اے دریا! اے امڈے دریا! اے کاش نہ تو اسطرح بہے
جن راہونپر تو چلتا ہے ان راہونمیں پانی نہ رہے!
اللہ کرے تری راہ گزر پر لان- اور لوٹ- للا راگیں؟
یہ شورہ زارونکے پودے اگتے ہی رہیں اگتے ہی رہیں
توہے وہ جفا پرور جس نے کتنی ہی ڈبوئی ہیں ناریں
آئی تھیں ترے پہنا پر جو اس پار پہنچنے کی دھن میں

(۴)

اے بہنو! اے بہنو! میرا رواں رواں ہے جاگ اٹھا
گھنٹیوں کی اس ٹن ٹن سے- اوروں کو بتاوں کیسے کہو
یہ عشق ہے میرے دل میں جو- سب انگ ہیں جس سے جھوم اٹھے!

وہ تیر کہ میرا دل جس سے- زخمی ہوا خونا خون ہوا
اس سے ہی سندیسہ بھیجتا ہے خوشیوں کا مرا مہین وال مجھے
یہ گھنٹیاں کیسی بج بج کے- رکھتی ہیں خوشی میں مجھکو مگن

کل مہی کا مکھڑا دیکھنے کو کس شوق سے آدھی رات اٹھی
آنکھیں تھیں مری ترسی ترسی- پلکوں سے نیند کو جھاڑ دیا
جب ٹن ٹن کرتی گھنٹیوں کی آوازیں میرے کان پڑیں

فی الفور تپکتی نس نس میں اک اور ہی مستی دوڑ گئی
سب دنیا میرے خیالوں کی یادوں میں اس کی محو ہوئی
دل دھک دھک کرکے کہنے لگا یہ مجھم سے ذرا کہنا تو سہی
جب پھر دونوں کا میل ہوا- کس طرح سے پیش آئے گا مہی؟

تن من میں بسا ہے میت مرا جب تک کہ مرے دم میں دم ہے
وہ سوز بھرے دل جن کی تپش ہے میرے دل میں پوشیدہ
اللہ کرے ان کا دامن ہرگز نہ ہو میرے دل سے جدا!

میں نیند میں بھی ان گھنٹیوں کی سنتی رہی میٹھی آوازیں
جو دریا کے اس پار کہیں بجتی تھیں ٹن ٹن کرتی ہوئی
دل وجد سے جھوما جاتا تھا۔ اللہ! اس وادی کی مستی!

اللہ کے کرم سے آئی مجھے اس کنج میں اس گلشن کی مہک
دیکھو! میں وہاں خود جاونگی تا آمنے سامنے دیکھ سکے
خود میری نظر خوش کن جلوے محبوب کے پیارے مکھڑے کے

میں سوئے سوئے سنتی رہی ان گھنٹیوں کی ٹن ٹن کی صدا
جو دریا کے اس پار کہیں بجتی تھیں رسیلی سحر بھری
ساجن کا سندیسہ دینے کو دل کرتا ہے پل پل سرگوشی
اک جھن جھن سی اک کن من سی۔ اٹھتی ہے مسلسل نس نس میں

ہاں یہی بجا ہے۔ یہی روا۔ میں جاوں جہاں ہے میت مرا
سویا ہے رکھے سر بالیں پر وہ۔ حق نہ کرے! ہو نذر قضا
خالی ہو چھپر ڈھوروں کا۔ اے میرے خدا! اے میرے خدا!

بھینسوں کی راکھی کرتا ہے۔ بیکا نہ ہو اس کا بال کہیں
وہ ہے مری زینت کا ساماں۔ وہ میری ساری دنیا ہے!
دنیا ہمیں کوسے تو کیا ہے۔ اس عشق کو کوئی دوش نہیں!

(۵)

سید۔ ہر سو پانی ہی پانی تھا اور کنارا دور ہی دور!
جاں جوکھوں میں ڈال کے سوہنی کرنے لگی دریا کو عبور
دل میں گنے کی ایک خلش تھی جس سے تھی باحال پریشاں
دلدل جیسے ویرانے میں ترساں ترساں۔ لرزاں لرزاں
کہنے لگی گر شان کرم ہو مائل رحمت۔ پھر کیا غم
گردابوں کا لامتناہی سلسلہ بھی ہے عین عدم
تجھ سے پہلے اوروں کو بھی ایسے مراحل پیش آئے
تجھ کو کیا اندیشہ جب وہ ان کو سب طے کر پائے

طوفانوں کی بات ہی کیا ہے ان سے خوف نہ کھا زنہار
کود بھی پڑ دریا کے اندر اپنی مشک کو کر تیار
تاکہ ملے تو اپنے مہی سے ملگجے- دور کنارے پر-
جہاں کہیں طوفانی ارادہ اور ہمت ہوں سینہ سپر
وہاں یہ طوفانی دریا بھی ہوں گے ہم آہنگ ترے
یونہیں گزر جائیں گے پاس سے غراتے- بل کھاتے ہوئے
کاش کہ ہم موجوں کے دوارے پیا ملن کی ریت منائیں
یہ ہے شاہ لطیف کا کہنا جس کو سدا وہ شعر میں گائیں

سوہنی- عشق کے ارفع جذبوں کو گو روکنے کی تدبیریں کیں
پھر بھی یہ ایسی چیز ہے جس پر انساں کا کچھ زور نہیں
اپنی جاں پہ کھیل کے لو میں کود پڑوں گی دریا میں
اس سیلاب کو چیر کے اپنا کروں گی پیدا رستہ میں
جن کو لگن ہو اپنے مہی کی وہ روکے کب رکتے ہیں
جن کو تڑپ ہے پیا ملن کی طوفاں سے کب جھکتے ہیں

سید- گر دریا میں کود نہ پڑتی سوہنی عشق سے شعلہ بجاں
پھر اس دار فنا میں ہوتا اس کا چرچا عام کہاں
چند ہی دن رہ سہہ کے یہاں- اوروں کی صورت مٹ جاتی
مہیں وال نے دوہ کے بھینسیں اس کی زیست بدل ڈالی
گھونٹ پلاکر دودھ کے اس کو اور ہی چیز بنا ڈالا
اس کو حور بناکر خلعت تاب دوام کا پہنایا
سید یوں کہتا ہے! "بدلی عشق نے یکسر اس کی کایا
دوسرے انسانوں کی صورت موت تھی اس کی بھی مایا
ڈوب گئی وہ لیکن ڈوب کے پایا موت سے دوہرا صلہ
زیست گنوائی- زیست کے بدلے- کون بتائے کیا پایا"

سوہنی- وہ گرداب ہے! میں ہوں یہاں پر- دم کا غصہ- ہائے غضب!!
کون دھرے دریا میں پاؤں گر نہ ہو قدرت اس کا سبب؟
صبح سویرے ایک انوکھا مجھ کو خواب نظر آیا
ساہڑ نے باندھا وہ رشتہ جو ہے مری جاں کا رشتہ

تن کا رشتہ خام سہی- بات اور ہے من کے بندھن کی
کاش یہ رشتہ کبھی نہ ٹوٹے- یہی تمنا ہے من کی
میرے خدا! ساہڑ کو ملادے تاکہ وصال جاناں سے
زیست کا بندھن ٹوٹے بھی تو اک تکمیل کے عنواں سے

(۶)

روز ازل اللہ نے کہا تھا-- اللہ واحد- لافانی-
روحوں سے گھن گرج صدا میں- "میں نہیں خالق سبحانی؟"
تب بھی تھا سوہنی کے سینے میں اک ہیجان ہوا پیدا
دل کے میت ساہڑ کی خاطر عشق کا طوفانی جذبہ
یہ بھی حکم خداوندی تھا جس سے کڑیل موجوں نے
کیا دھما دھم کوٹتی افتادوں سے گھڑے کو دو ٹکڑے
جو بھی مشیت نے اس کی قسمت میں لکھا روز ازل
بالکل پورا ہوکے رہا اس دنیا میں بے رد و بدل

(۷)

مرا تن جلے- مرا من جلے
وہ بھڑکتی آگ ہے شعلہ زن
کہ ہیں پھنک رہے مرے جان و تن
مرا تن جلے- مرا من جلے

مجھے پیاس ہے- مجھے پیاس ہے
مرے دل میں آگ ہے پریت کی ہے بھڑکتی لو مرے میت کی
میں پیوں تو پیاس نہ بجھہ سکے نہ بھڑاس دور ہو بحر سے
میں پئے بھی جاوں تو کیا بنے مری پیاس کچھہ بھی نہ مٹ سکے
مجھے پیاس ہے- مجھے پیاس ہے

میر- رات ہے کاری کاری
گھڑا ہے کچا- کورا
ماس کے دن آخر میں
اندھیارے میں کھوئے
چاند کی ایک کرن بھی
دیتی نہیں دکھائی!
رات ہے کاری کاری

دریا شور مچائے
لو- ساہڑ کی خاطر
سوہنی تج کر گھر کو
آدھی رات کو آئی
یاں- دریا کے کنارے!
ذات خدا کی ہے جو
اس کو پار اتارے!!

چیتے گھوم رہے ہیں
یہ جیون کے بیری
بار خدایا! میرا
عشق کبھی نہ ٹوٹے
دل کا گھڑا نہ پھوٹے
جب میں چڑھے دریا میں
کودوں بے باکانہ
جان کو جان نہ جانوں-
رات ہے کاری کاری

(۸)

سوہنی- جب تری آرزو ہوئی زیست کا رخ پلٹ گیا

(۹)

لوگ کھڑے اس پار پکاریں آجا۔ سوہنی آجا
لیکن دو خطروں میں گھر کر دل میں ہے میرے دگدا
ایک طرف طوفانی موجیں دوسری جانب گھڑیا
لیکن سانچ کو آنچ نہیں ہے۔ ڈوبنے کی کیا چنتا!
آر پار گذرتی ناریوں کا دیکھو تو تانتا

میر۔ حق کے بھروسے پر تو بنالے ایماں ہی کو سہارا
جو کہنا ساہڑ کا مانیں ان کو نہیں خسارا
بودی جھاڑیاں پکڑیں دانا جب کہ تیز ہو دھارا
شاہ لطیف کہے نرسل میں پنہاں بھید ہے نیارا
لے آتا ہے تجھ کو بچاکر جب ہو پاس کنارا
یہ بھی ہے ممکن ٹوٹ کے تجھ کو لے ڈوبے یکبارہ
سوہنی گر ساہڑ سے جدا ہو ایک نجس پیکر ہے
اور مہار کے ساتھ اگر ہو پاک تریں گوہر ہے
دور اگر ہو وہ ساہڑ سے کملا۔ مرجھا جائے
اس کا کھرا لہکتا جوبن دھوپ سے گہنا جائے
ہائے وہ اس کا حال زبوں۔ وہ ٹوٹے ہاتھ اور پاوں
بیماری سے بگڑی صورت۔ رسوا گاوں گاوں
ہجر کے مارے بیکل ہوکر۔ ہر دم آہیں بھرتی
ساہڑ کی فرقت کے مارے گھلتی۔ کڑھتی۔ مرتی!
اور اگر ساہڑ سے ملے وہ نکھرے اس کا چہرہ
دم کے پاس اک روگ سے جیسے سارا جیون دکھیا
ایک نظر ساہڑ کی اس کو جیسے میٹھا دارو
ایک جھلک اس چہرے کی مکھڑے میں جگائے جادو!
سوہنی آج کی رات ہے دریا اک طاغوت سراپا
دیکھنا! اس منجدھار کے اندر بھول کے بھی مت آنا

سوہنی- یارب دم کہیں جاگ نہ اٹھے- ادھر ادھر نہ پوچھے
نہیں نہیں پوچھے- "دم بیچارہ کا ہے کرے- کٹ جائے؟"
سوہنی یوں کہتی ہے- "جنہیں ہے کام کی دھن وہ انساں
گردابوں میں کام کریں گے خنداں- رقصاں رقصاں
اپنے مہار کی خاطر میں نے تن وارا- من وارا
اپنی کھال اور اپنی ہڈیاں- اپنا جیون سارا!"

سیر- جب تک وہ جیتی رہی اس نے سکھ کی نیند نہ پائی
اپنے ہی سجنوں کی خاطر جاں مٹی میں گنوائی
جب تک جسم میں تاب و تواں تھی وہ بے کار نہ بیٹھی
مر کر وہ موجوں پر ترتی پاس مہار کے پہنچی!

سوہنی- رات کا اندھیارا بہتر ہے- چاندنی رات ہے زہریلی
میں نہ کسی کی صورت دیکھوں- صرف اک صورت ماہی کی

سیر- بلیوں گہرا پانی تھا وہ جس میں سوہنی ڈوب گئی
اتھلے پانی کی کھائی تھی اور نہ کیچڑ دلدل کی
مرتے دم اس کی آنکھوں میں پیارے دوست کا مکھڑا تھا
سنو سنو! وہ کیا کہتی ہے- یہی تھا صرف پیام اس کا-
"میں نے نہ کچھ سسرال سے پایا اور نہ میکے سے پایا
سجنوں ہی کے لطف و کرم سے پائی محبت کی مایا"

(ماہ نو کے شکریہ کے ساتھ)

شاہ عبداللطیفؒ

شمال سے ہوا چلی

مترجمہ
شہاب رفعت

شمال سے ہوا چلی　　نفس نفس میں قاہری
نہ پاس دلق- نے ردا　　اور اس پہ یہ خنک ہوا
وہ جھونپڑونکی اک قطار　　حیات- پالے کی شکار
وہ جھونپڑے جو زور سے　　ہواوں کے ہیں کانپتے

شمال سے ہوا چلی　　نفس نفس میں قاہری
نہ پاس دلق- نے ردا　　اور اس پہ یہ خنک ہوا
بس ایک کملی مختصر　　کہ کھینچ لوں ادہر ادہر
وہ میرے تنکو ڈھانپ دے　　تو جاڑے سے اماں ملے

پژاوے میں دبے ہوئے　　وہ برتنوں کے سلسلے
تو بھی اپنا عشق کیا　　یوں نہ ڈھانپ رکھیگا؟
آنچ اگر پژاوے سے　　دور ہو تو پھر گھڑے
تپ کے پک سکینگے کیا؟　　ہے تجھے یہی روا
دل میں ہے ترے نہاں　　ایک سوز جاوداں
جیسے آگ تند و تیز　　بھٹیوں کی شعلہ خیز

میرے دل- پژاوں سے　　تو بھی درس عشق لے
یہ ہے عشق کا عیار　　اس سے عشق کامگار
دل میں رات دن جلے　　آگ زور شور سے
پھر بھی تیرے سینے سے　　نہ اک ذرا دھواں اٹھے

سوز دل کا دل میں ہو!
راز دل کا دل میں ہو!

شاہ عبداللطیفؒ

عمر ماروی

مترجمہ

ابن انشا

ماروی مالیر گاؤں کے ایک غریب گلہ بان کی لڑکی تھی جس کی نسبت اپنے ہی قبیلہ مارو کے ایک نوجوان سے ہوچکی تھی۔ لیکن عمر کوٹ کا راجا سمرو ایک شخص کے بہکانے سے اسے اٹھا لے گیا تاکہ اسے اپنے محل میں داخل کرلے۔ وہاں اس نے ماروی کو ایک دو منزلہ مکان میں نظر بند کردیا۔ مگر وہ وفا شعار و ثابت قدم رہی۔ اس نے عمر کو دھمکی دی کہ تم قریب آنے کی کوشش کروگے تو میں خود کشی کرلونگی۔ آخر یہ طے پایا کہ اگر بارہ مہینے کے اندر اندر اس کے عزیزوں نے اسے آ کر چھڑا لیا تو ٹھیک ورنہ ماروی کو سمرو سے شادی کرنا پڑے گی۔ وہ اس بالا خانہ میں سال بھر بند رہی اور عزیزوں کے انتظار میں مہجوری کے گیت گاتی رہی۔

سندھ کے اس مقبول رومان کا زمانہ عربوں کی صوبیداری ختم ہونے کے فوراً بعد کا ہے۔ جب سندھ میں سمرو قبیلے والے برسر اقتدار آئے۔ مارو قبیلے کا نام بھی ہے اور ماروی کے محبوب کا نام بھی۔
ترجمہ۔ سورلے صاحب کے انگریزی ترجمے کے توسط سے کیا گیا ہے۔

جو کانوں میں میرے یہ لفظیں پڑیں
"بتا میں بھلا تیرا مالک نہیں"
مرے دل نے چپکے سے "ہاں" کہہ دیا
کہ کچھ اور کہنا تو ممکن نہ تھا
مرے لوگ مجھ سے بہت دور تھے
مرے پاس آنے سے معذور تھے

مرا قید ہونا ہی تقدیر تھی
یہ پتھر پہ قدرت کی تحریر تھی
کہ اپناوں گھر بار کو چھوڑ کر
یہ زنداں- یہ زنداں کے دیوار و در
جو چروا ہے سے اپنے میں دور ہوں
تو اس حال کو زندگی کیوں کہوں؟
خدا وند میرے تو یہ حکم دے
کہ اب ماروی ماروؤں سے ملے
لکھی تھی مری زندگانی میں قید
ہوئی رنج و درد و مصیبت میں صید
کتاب مقدس میں ہے جو بیاں
"مرا من ترے پاس- تن ہے یہاں"

یہی اک دعا ہے خدا وند سے
وہ قدرت سے اپنی یہ ساماں کرے
عزیزوں سے اپنے میں جاکے ملوں
شب و روز بیٹھی یہ سوچا کروں
"جو لکھا گیا پھر نہ بدلا گیا
قلم ہوگیا خشک تقدیر کا"

تراوش ہوئی کلک تقدیر سے
کہ مارو تو کانٹے چنیں دشت کے
ادھر میں الگ اس طرح سے جیوں
کہ ان بالا خانوں میں بیٹھی رہوں
عزیزوں سے دوری- وطن کا یہ تیاگ
لگاوں نہ ان اونچے محلوں میں آگ؟

ہر اک شے- کہیں بھی ہو کیسی بھی ہو
پلٹتی ہے اپنی قدیم اصل کو-
مرے جی پہ بھاری ہے ان کا بجوگ
کہاں ہیں کہاں ہیں وہ صحرا کے لوگ
یہاں ان کے آنے کی صورت بنے
کہ مالیر جانے کی صورت بنے

(۲)

ماروی کہتی ہے:-

نے پیامی ہے نہ پیغام عزیزاں کوئی!
گرد صحرا سے نہ ابھرے گا شترباں کوئی؟
میرے اللہ! مری حسرت دیدار کو دیکھ
بھیج اس دیس میں اس دیس کا مہماں کوئی
خوش ہوں- مسرور ہوں یہ راہیں یہ قلعے یہ حصار
آئے پھر قطع مسافت کئے جولاں کوئی
دھوؤں ان آنکھوں سے اس کے قدم گرد آلود
جان سکتا ہے مرے شوق کا پایاں کوئی
دور افتادہ ہوں- محبوس ہوں- غم دیدہ ہوں
لوگو اس درد کی تسکین کا ساماں کوئی

سید صاحب کہتے ہیں:-

لے نویدیں لئے آیا کوئی ڈاچی والا
اپنے محبوب کو یادوں سے فراموش نہ کر
ایسی پاگل تو نہ ہو- لوٹ کے آئے گا یہاں
ایک پل کے لئے قلعے میں ٹھہر- اور ٹھہر
ایک ہی پل کے لئے قلعے میں رہنا ہے تجھے
دیکھنا تجھ سے نہ کملی یہ پرانی چھوٹے
پیاری من موہنی اونچا ہے گھرانہ تیرا
وضع مت چھوڑنا- دل دکھتا ہے مانا تیرا
سوئے مالیر بھی ہوگا کبھی آنا تیرا

ماروی کہتی ہے:-

میرے بابل کے یہاں سے کوئی آخر آیا
کون آیا ہے خدا را اسے لاو لاو
اس کے قدموں پہ میں گر جاونگی ہوکا بھر کے
اس کو دکھلاونگی اس دل کے یہ آلے- گھاو
"میرا کچھ دوش نہیں بات یہ مانو میری
اپنی مرضی سے نہ آئی ہوں- نہ ہرگز آتی"

(۳)

خداوندا! وہ گلہ بان مارو مجھے اپنالیں- میری لاج رکھ لیں
میں کتنی بھی بری ہوں- ہاں بری ہوں وہ لطف و مہربانی سے نہ گزریں

ادھر مالیر میں برکھا ہوئی ہے پرندے چہچہاتے اڑ رہے ہیں
مرے کپڑوں کا عالم دیدنی ہے کہ میلے- بے تکے- اوگن بھرے ہیں
تو عیبوں کو چھپانے والا ٹھہرا
خداوندا! تو میری لاج رکھنا

(۴)

مری چولی میں ٹانکے سینکڑوں ہیں
مری کملی پرانی ہے- پھٹی ہے
چھوئی پونی- نہ گز بھر سوت کاتا
کہ آس اپنے عزیزوں سے لگی ہے
جو دھت میں میں نے پہنے تھے وہ کپڑے
مرے تن کے لئے کافی رہیں گے
مری چولی میں ٹانکے سینکڑوں ہیں
مری کملی پرانی ہے- پھٹی ہے

کسی دن بھی نہ بال اپنے سنوارے
پریشاں زلف خوشبو کھو چکی ہے
کبھی مارو کے مکھڑے کو میں دیکھوں
فقط دل میں یہی حسرت بسی ہے
میں پھر صحرا میں اپنے گھر میں پہنچوں
کہ یہ جینا بھی کوئی زندگی ہے!

مری چولی میں ٹانکے سینکڑوں ہیں،
مری کملی پرانی ہے۔ پھٹی ہے
اسی عالم میں میں صحرا میں پہنچوں
مرے دل میں جو حسرت ہے۔ یہی ہے
کہ مارو مجھ کو دیکھیں اور یہ جانیں
یہ جیتی تھی امیدوں کے سہارے
کہ ہم آئیں گے اس کی سار لیں گے
چھڑائیں گے غم زنداں سے بارے۔
ہوا ہے جس جگہ سے میرا آنا
کسم کا پھول واں کھلتا نہیں ہے
جہاں شادی کے میلے ہوں وہاں بھی
مجھے کملی سوا جامہ نہیں ہے

(۵)

نہ بالوں کو دھونا دھلانا اسے
نہ ہنسنا نہ پینا نہ کھانا اسے
عمر!۔ ماروی گیت گاتی پھرے
تری داد کے۔ تیری بیداد کے
ترا ظلم بخشا نہیں جائے گا
یہ اک دن ترے سامنے آئے گا

نہ بالوں کو پانی دکھانا اسے
نہ زلفوں کی بگڑی بنانا اسے
وہ بانکے وہ سبزہ گھروں کے مکیں
انہیں ماروی بھول سکتی نہیں
عمر! ماروی کو کہاں یہ پسند
کہ بیٹھی رہے تیرے محلوںمیں بند
نہ بالوں کو پانی دکھانا اسے
نہ زنداں سے باہر ہی جانا اسے
اسے بھائے کیا ماروؤں کے بنا
یہ صابن یہ خوشبو یہ عطر حنا
کٹھن ہے یہ اس کے لئے زندگی
کہ گوری ہے دیہات کی ماروی
نہ بالوں کو پانی دکھانا اسے
نہ بھولے سے بھی مسکرانا اسے
ہے کانوں میں اس کے سدا گونجتی
صدا اے عمر! تیرے انصاف کی
شکایت کرے ہے وہ اندوہگیں
"مرے لوگ مجھ پاس آتے نہیں"

اداسی پہ مائل ہوئی ماروی
غم دل کی گھائل ہوئی ماروی
یہ الجھے سے گیسو- یہ چہرہ اداس
وہ اٹھتی جوانی کی بو ہے نہ باس
غموں نے اڑادی ہے چہرے کی آب
اداسی سے سنولا گیا ہے شباب

لطیف اسکے پنڈے کو لو جو لگی
اڑی باس خوشیوں کے کافور کی
وہ گوری کہ من جسکا بھاری رہے
خوشی کس طرح اسکو پیاری رہے
بھلا چھٹ کے پیارونسے جینا ہے کھیل
نہ مسکان لب پر نہ بالوں میں تیل
جدھر اس کا مالیر آباد ہے
ادھر رخ ہے ہونٹوں پہ فریاد ہے
"میں مارو کی سمرو! میں مارو کی ہوں
ترے گھر کی خوشیوں کو خوشیاں کہوں؟
یہ پھانسی کا پھندا ہیں پھانسی کا جال
میں تیری بنوں یہ تو ہونا محال
مرے دل کے وہ لوگ مالک ہوئے
چھڑانا ہے مشکل اسے قید سے
جدھر اس کا مالیر آباد ہے
ادھر رخ کئے وقف فریاد ہے
اسے ماروؤں نے جو دی تھی کبھی
ابھی پاس اس کے ہے کملی وہی
تو اس کو تو سمرو نہ زنجیر کر
کہ مشکل ہے اس من کا آنا ادھر

جدھر میرا مالیر آباد ہے
ادھر قبلہ جان نا شاد ہے
میں قلعے پہ چڑھ کے پکاری بہت
میں کرتی رہی آہ و زاری بہت

کسی نے نہ لیکن سنی یہ فغاں
مرا درد سنتا ہے کوئی کہاں
عمر جسکا من ہو دکھی اور اداس
اسے بھائیں کیسے یہ اجلے لباس
پیا اپنے صحرا میں آہیں بھریں
غموں میں گرفتار نالے کریں
وہ ناری ہے اے سمرو! ناری کہاں
وہ اپنے پیا کی ہے پیاری کہاں
جو الفت کے قول و قسم توڑ دے
جو پی سے خیال وفا چھوڑ دے
مرے پی پہ بھاری یہ ٹھنڈی ہوا
ترے نرم گدوں پہ سووں میں کیا
عمر! میرے کپڑونپہ ہنستا ہے کیوں
گدیلوں پہ آرام کیسے کروں؟
جو پی میرا صحرا میں آہیں بھرے
غموں میں گرفتار نالے کرے
عمر! اپنے شربت کے شیشے اٹھا
عزیزوں میں پیاسے ہی رہنا بھلا

(۶)

مرا دل ہے انہی کے ساتھ سائیں
جو جنگل کے دہاتو کے مکیں ہیں-

مجھے چھوڑے تو انکے پاس جاوں
انہی کا سا پیوں- ان کا سا کھاوں
جہاں تک سائیں دنیا میں جیونگی
اسی پیارے کے قدموں پر چلوں گی

میں بے تقصیر بیٹھی جی کھپاؤں

یہی سوچوں کہ دیس اپنے کو جاؤں

انہی پیاروں عزیزوں سے ملوں میں

جو موٹے جھوٹے کپڑوں ہی میں خوش ہیں

میں اس کملی کو چھوڑوں- کیسے چھوڑوں

اس آرام اور راحت کی طلب میں

جو دو دن کے لئے ہے- پھر نہیں ہے

(۷)

کہاں گیا مرا حسن اے سمرو! چہرا میرا میلا

قسمت نے میرا روپ انیلا چھین لیا- سب لوٹا

اے سمرو اک بار کسی کا روپ اگر لٹ جائے

لاکھ جتن کر دیکھے لیکن پھر وہ بات نہ پائے

کھو کے میں اپنا روپ اے سمرو! دیس اپنے کیا جاؤں

اپنے نگر کے چرواہوں کو کیسے مکھ دکھلاؤں

جیسے تھا یاں آنا میرا ویسا ہی میرا جانا

اکثر- جیسے برستی بوندیں پل پل ہے شرمانا

ان اونچے چوباروں میں جو جیونکے دن بیتے

زحمت- ذلت اور ستم تھے مجھکو وہ یاد رہینگے

مجھکو تو بس پی کی ہے چاہت لیکن میں شرماوں

کس منھ سے سر اونچا کرکے ماروؤں آگے جاوں

مجھ کو کہیں تو دفن ہی کردے اے سمرو! اے بیری!

میں نے یہاں پر آ کے چھوڑی ریت وہ چرواہونکی!

کاشکے! یہ پیدا ہی نہ ہوتی ہوتی تو مر جاتی

عمر کوٹ میں آ کر اس نے جیتی یہ بدنامی

چو باروں میں بیٹھی کڑھتی ایسے وقت گزارے
چرواہوں کو مدد کی خاطر پل پل پڑی پکارے
اے اللہ! سنے جو میری قید ہی میں مرجاوں
دن کو تو بیٹھی رووں دھووں شب کو چین نہ پاوں
لیکن مجھ کو موت سے پہلے گھر میرا دکھلادے
کیا دھووں میں کپڑے اپنے میلے اور پرانے
مٹی میں ملی عزت میری مالک میرے کرم کر
سمرو! ہے بڑی طاقت والا رحم دلا اسے مجھپر
گاوں میں اپنے ہوگا وہ بانکا بیٹھی سوچ رہی ہوں
مجھ کو تو پی سے آس لگی ہے کب جاوں اسے دیکھوں
گھر والوں تک بات نہ پہنچی میری اس بپتا کی
ورنہ یہ قیدی قید میں اپنی اتنی بیاکل ہوتی؟
بھول گئے مجھے مارو شاید گھر کی یاد ستائے
اچھا ہے یونہی یاد میں ان کی موت مجھے آجائے
لاش کو میری مالک میرے گھر میرے پہنچانا
مر کر چین ملے کچھ شاید ماروں میں دفنانا
قبر میری مالیر میں ہو تو میں تو یہی سمجھونگی
موت نہیں ہے جیون ہے یہ چین سے میں سوونگی

(۸)

انہیں سمرو میں کیسے بھول جاوں
کہ وہ گلے چرانے والے پیارے
مرے جیون میں- رگ رگ میں بسے ہیں
بھلانا ان کا آساں تو نہیں ہے
محبت ان کی دل میں جاگزیں ہے
بہت دن ہوگئے ہیں مجھ کو دیکھے

وہ گلہ بان وہ ان کے گھروندے

یہ جامے ریشمیں۔ نرم اور ملائم

بھلا اس بات کے شایاں ہیں سمرو

کہ چرواہے کی بی بی ان کو پہنے

وہ موٹے کھردرے جاموں کو اپنے

کہیں جو لاکھ ہی کا رنگ دے لے

تو شالوں سے ہو بڑھ کر ان کی شوبھا

نہ اون ان کے برابر کی نہ مخمل۔

کوئی کپڑا نہ ان کو پہنچے سمرو!

مرا کمبل کہ موٹا۔ کھردرا ہے

مجھے یہ سارے جاموں سے بھلا ہے

میں یہ اپنے قبیلے کی نشانی

یہ کمبل۔ کیوں اتاروں؟ اس سے پہلے

یہ بہتر ہے کہ موت آجائے مجھ کو!

ہوئے پھر تازہ یادوں کے وہ گھاو

مجھے ان گاوں والوں کی جدائی

بہت ہی مضطرب رکھتی ہے سمرو!

مرے دل میں ابھی ان کی جگہ ہے

جو صحرا کے گھروندوں کے مکیں ہیں

جہاں مارو کا۔ پیارے کا ہے ڈیرا

خدایا اس جگہ تو مجھ کو پہنچا

نہ تم جی کو دکھاو میرے پیارے

نہ یوں آنسو بہاو میرے پیارے

جہاں غم کا ہے۔ دکھ کا ہے بسیرا

وہیں دیکھوگے پھر خوشیوں کا ڈیرا

سیر صاحب کہتے ہیں:-

جہاں دکھ ہیں وہاں سکھ بھی ہے گوری
یہ چرواہے کا دل بھی جانتا ہے
وفا پر تو جو قائم یوں رہے گی
تو یہ محبس- یہ زنداں چیز کیا ہے
ترا دل نا امیدی میں نہ بھٹکے
یہ زنجیریں تو گر جائیں گی کٹ کے

ماروی کہتی ہے:-

من میرے کا مالک مارو — مارو کا من میرا
کیوں اپنا منہ دھووں میں سمروا! — مالک مرا کہے گا
اجنبیوں میں گئی تھی تو کیا — منہ دھونے خوش ہونے؟
لے میں چلی اب پی کے ڈیرے — چھوڑ کے رونے دھونے

(ماہ نو کے شکریہ کے ساتھ)

شاہ عبداللطیفؒ

آیاتِ وجدانی

مترجمہ
جمیل نقوی

Scanned with CamScanner

آتش عشق

بے چینی سے لوٹ رہے ہیں
عشق کی آگ میں جلنے والے
لب پہ مسلسل آہیں- نالے
روئیں روئیں میں آگ لگی ہے
رگ رگ جل کر راکھ ہوئی ہے
انگ انگ میں کرب جلن کا
ایک ہی عالم ہے تن من کا
دیکھ اگر ہے تاب نظارا
آتش عشق کا کھولتا دھارا

دہکے ببولوں کے انگارے
تیکھے کانٹوں کی سیخیں
ان پہ تپے گر تن من میرا
کیا میں ان سے منہ موڑوں گا؟
پروانوں سے جاکر پوچھو
کیا ہے مزا جل جانے میں
کیوں جلتے ہیں- کیوں مرتے ہیں
بڑھ بڑھ کے یہ مستانے
عشق کا تیر لگا ہے کاری
جیون پر ہے پل پل بھاری
شمع کی لو پر- دار کے تن میں
دم لیں گے یہ دیوانے

پیام

پھر رخ دلدار سے پیدا ہے شان التفات
کھیلتی ہے روئے روشن پر تبسم کی ضیا
میرے کاشانہ میں آتا ہے وہ جان نوبہار
ہر قدم پر کیف و رنگ و نور برساتا ہوا
کون کہتا ہے مہہ تاباں کو اس رخ کا حریف
چودھویں کو گرچہ اس کا پیکر آئینہ فام
تابناکی میں پہنچ جاتا ہے تا اوج کمال
پھر بھی خورشید درخشاں سے ہو کیسے ہمسری
ذرہ کیسے روکش خورشید عالم تاب ہو

میرے گھر میں غلغلہ ہے آمد محبوب کا
شادیانے بج رہے ہیں۔ گونجتے ہیں زمزمے
کل جہاں کو رشک ہو میری سعادت پر تو ہو
اب زمانہ میں ہوں لاکھوں مہر تاباں آشکار
اور ہزاروں چاند سیمائے فلک پر جلوہ کار
مجھ کو ذات حق کی شان کبریائی کی قسم
گر نہ میرے روبرو ہو وہ رخ عالم فروز
ہر طرف چھائی نظر آئیں گی تا حد نظر
میری آنکھوں کو بھیانک رات کی تاریکیاں
اے نگار شب یہ کم جلوہ سبک پیکر ترا
کیسے ہو سکتا ہے اس محبوب یکتا کا مثیل
جبکہ اس کا پیکر زریں جہاں افروز ہے
اسکے حسن پر تجمل میں تب و تاب دوام
اور تو۔ تیری تجلی۔ حلقہ شب کی اسیر

صبحدم جاگوں تو ہو میری نگاہ بیقرار
اے مرے محبوب! تیرے روئے عالمتاب پر
ہر نفس ہو گرد شمع رخ نگاہوں کا طواف

کاش پہنچادے کوئی تجھ تک یہ میری آرزو
یہ مرے دل کا پیام۔

(ماہ نو کے شکریہ کے ساتھ)

شاہ عبداللطیفؒ

لطیف چئی[1]

مترجمہ

ابن انشا

---

(۱) لطیف چئی۔ "لطیف کہتا ہے"۔

جمال ناز

مہرباں مہرباں وا شگفتہ جبیں
میرے آنگن میں آتا ہے پیارا مرا
اس سے بڑھ کے ہے میرا وہ مہر مبیں
چاند اچھا سہی چودھویں رات کا

میرے در پہ ہے لوگوں کی منڈلی کھڑی
میرے پیارے کی سب لوگ باتیں کریں
میرے گھر میں تو ہے آج اتری خوشی
جن کو جلنا ہے جلتے ہیں- جلتے رہیں

سینکڑوں- مہر ہوں بیسیوں ماہ ہوں
مجھ کو سوگند اللہ کے نام کی
اس کے مکھڑے بنا منزلوں منزلوں
رات ہی رات مجھ کو نظر آئے گی

کتنا کم ارز ہے ہیچ ہے چاند تو
شب کو آئے نظر شب کو چمکا کرے
میرے پیارے کے آگے بہت ماند تو
دائمی ہیں اجالے مرے دوست کے

صبح دم اٹھ کے محبوب کے کان میں
یہ سندیسہ ہمارا سنانا سجن
"تجھ پہ ہم غمزدونکی ہیں آنکھیں لگیں
دیکھ ہم کو نہیں بھول جانا سجن"

یہ نین میرے

ان نینوں میں پیت بھری ہے ان کی انوکھی ریت
کھوٹے کا کبھی کھوٹ نہ دیکھیں- دیکھیں پیت ہی پیت

کاگوں کو ابھی نوچ کھلاوں- پاوں جو بگڑے طور
یہ نیناں کچھ اور جو دیکھیں- پیت بنا کچھ اور

پیاروں کی جہاں سنگت دیکھے جم کر رہے نگاہ
تن من کو مرے صحبت ان کی کعبے کی درگاہ

دن بھر دیکھیں سیر نہ ہوویں پیت کی ان کو پیاس
پیت جو پائیں تب کبھی آئیں لوٹ کے میرے پاس

تیغیں پیت کے رن میں ہاریں نینوں کی وہاں جیت
کس کس کا دکھ درد اپنائیں- ان کی انوکھی ریت

محبت بنا کچھ درکار نہیں۔

وہ دوست جنہوں نے من میں مرے

مرے درد کا پودا بویا تھا

وہ دوست تو رخصت ہو بھی چکے

اور بار غم دل ساتھ مرا

اب چارہ گرو کچھ بولو نہیں

ان باتوں سے اب تمہیں حاصل کیا

مرے دوست تو شہد کے گھونٹ پئے

تجھے تلخ مزے کا پتہ ہی نہیں

ترے دوست تو ہوں گے جلو میں ترے

ترا دل تو مگر ہے غموں کا امیں

یہ جو اجنبی لوگ ہیں ان کی بتا

کبھی ان کو بھی یاد کرے گا کہیں؟

کبھی طنز سے پوچھیں گے اہل جہاں

ترے دوست کا ہاتھ کہاں ہے بتا

مگر اہل وفا تو جھجکتے نہیں

جہاں سر پہ چمکتی ہے تیغ جفا

بڑے ناز سے دیتے ہیں سر کو جھکا

نہیں مانگتے کچھ بھی اجل کے سوا

شاہ عبداللطیفؒ

سُر مارئی

مترجمہ

لطف اللہ بدوی

(۱)

کان [illegible]گ الستی کی پڑی جس دم صدا
قلب نے صدق و صفا سے کہدیا قالو بلیٰ
اور یاران وطن سے باکمال ذوق و شوق
میں نے فوراً عہد و پیمان محبت کرلیا

(۲)

جب سنے میں نے ازل کے دن حروف کن فکاں
دل نے پیدا کرلیا مارو[۱] سے ربط جاوداں
سومرا! میرے تن نازک پہ یہ دام بلا!
کن گناہوں کے عوض ہے بار یہ طوق گراں؟
کردیا پابند تونے جسم کو بے جا حمیر[۳]
تختۂ مشق ستم ہوں میں اسیر ناتواں

۱۔ مارئی کے عزیز و اقارب اس لقب سے مشہور تھے۔ ۲۔ مارو کے سومرہ خاندان کے حاکموں کو سومرہ بھی کہتے تھے۔ ۳۔ عمر سومرہ کا دوسرا نام ہے جس نے مارئی کو قید میں رکھا۔

(۳)

کہہ کے خلاق حقیقی نے حروف کن فکاں
جب کیا ارواح عالم کا ازل میں انصرام
ساتھ جنکے عمر گزری تھی ہوئی انکی طلب
ہے یہاں بھی ان الستی صحبتوں کا اہتمام

(۴)

جب ازل میں کن کے بعد اسنے کہا حرف فکاں
بن گئے اجسام عالم۔ بچھ گیا فرش زمیں
لکھ دیا قسام عالم نے مری تقدیر میں
قوم مارو کی محبت کا سرور دل نشیں

(۵)

ابتدائے آفرینش کی صدائے کن فکاں
تھی نفی اثبات کی آواز سے فارغ ابھی
اس خلا میں آگیا ان کا نظر حسن و جمال
جس کے آگے ہیچ تھی سارے جہاں کی دلبری

(۶)

ابتدائے آفرینش میں صدائے کن فکاں
جب تھی قید رنگ و بو سے سر بسر ناآشنا
جسم آدم کا خمیر آب و گل تھا بے نشاں
تب ہوا تیرے تعلق کا شرف مجھ کو عطا

شاہ عبداللطیفؒ

لیلاں چنیسر

مترجمہ

ابن انشا

چنیسر ایک بڑا نامور شخص تھا اور لیلاں اسکی بیوی تھی- اسی زمانہ میں ایک راجہ تھا جس کی بیٹی کونرو پرلے درجے کی مغرور تھی- اس نے اپنی سہیلیوں کے طعنوں سے چڑ کر چنیسر کو اپنے دام میں لانے کا تہیہ کیا اور لیلاں کو اپنے نہایت قیمتی ہار کا لالچ دلا کر مدعا حاصل کرلیا- اس طرح لیلاں اپنے شوہر کو کھو بیٹھی- شاہ بھٹائی نے اس واقعہ پر جو نظمیں لکھی ہیں- ان میں اس کی حماقت اور پشیمانی پر زور دیا گیا ہے-

(ا)

لیلاں- تونے کیوں محو کیا ہے انہیں لوح دل سے
حاصل زیست سمجھتے ہیں جو پیارے تجھ کو
اے مرے دسرو کنور! میرے چنیسر راجا
دل مرا آج بھی رو رو کے پکارے تجھ کو
ان کے زخموں پہ مدھر بولوں کا مرہم رکھنا
اب بھی اپنا جو سمجھتے ہیں بچارے تجھ کو
ان کو خلقت کی نگاہوں میں نہ رسوا کرنا
واسطہ دیتی ہوں جینے کے سہارے تجھ کو
میں تری پیت کی ماری ہوں بچاری ابلا
کچھ خیال آتا ہے اس بات کا بارے تجھ کو
تیری سو رانیاں- تو میرا اکیلا پیتم
دل بسارے تو بھلا کیسے بسارے تجھ کو

سید- ایک ادنیٰ سا گلو بند تھا جس کی خاطر
کھو دیا دل کے خداوند کو ناداں تونے
تجھ سے برگشتہ ہوا تیرا چنیسر راجا
کپٹی کونرو سے کیا ایک جو پیماں تونے
اپنی قسمت کا عجب الٹا ہے صفحہ غافل
بات کی ہے بڑی رسوائی کے شایاں تونے
چل گیا ادنیٰ سے زیور کی ڈلک کا جادو
جانے کیا سمجھا تھا چاہت کو مری جاں تونے

لیلاں- میں یہ سمجھی تھی کہ یہ ہار مرصع رتنار
ہاتھ آئے تو مرا روپ سوایا ہوگا
یہ نہ سمجھی تھی کہ یہ ہار ہے ظالم بیری
کپٹی کونرو نے کوئی جال بچھایا ہوگا

سیر- چل ذرا ڈال کے اب اپنے گلے میں پلو
ڈھونڈ اس چیز کو جو کھوئی ہے لیلاں تونے
شاید اب تجھ سے بنالے تجھے پھر اپنالے
عذر اس سے جو کیا عاجز و گریاں تونے
پھر بھی مقصود مبارک نہ جو دل کا پایا
در گہ یار سے محبوبہ حیراں تونے
یونہی فریاد کناں (عفو کی طالب رہنا
ہاں جو چھوڑا کہیں امید کا داماں تونے
ایک لغزش سے گنوایا- نہ گنوایا ہوتا
اپنے محبوب کا الطاف فراواں تونے
رکھنا فریاد و فغاں اب بھی وظیفہ اپنا
زیست کرنی ہے اگر زود پشیماں تونے

لیلاں- گن جو ہیں ایک زمانے کے گنائے تم نے
تم سمجھتے ہو کہ مجھ میں کوئی خوبی ہی نہ تھی
اپنی بخشش سے نوازو مجھے پیتم پیارے
کیوں کوئی اور بنے دل کی تمھارے رانی
میں نے سوچا ہے- بہت سوچا- یہ آخر پایا
دہر میں سوختہ جانوں کا مقدر ہے یہی
جس پہ غصے کی نگہ ہو تری پیتم پیارے
باندی بن جائے جو رانی ہو چھیتی رانی

(۲)

لیلاں- آج میں در پہ ترے آئی ہوں دسرو پیارے
اپنا اک عمر کا سرمایہ عصیاں لے کر
تو جو آزردہ ہے کیوں آوں میں در پر تیرے
دل آشفتہ و مجبور و پریشاں لے کر

شاہ عبداللطیفؒ

شعلے

مترجمہ

ابن انشا

گر تیرا تصور تجھے پروانہ بنادے
شعلوں کی حضوری میں وفا سے نہ گزرنا
دولھا کی طرح حجلہ محبوب میں جانا
اس حسن جہاں سوز کی تابش سے نہ ڈرنا
کچا ہے تو اے دوست گل خام کی مانند
بھٹی کی تپش تجھ کو سکھائیگی سنورنا

دیوانہ صفت آتش سوزاں پہ پتنگے
آتے ہیں- کبھی ہمنے ہراساں نہیں دیکھے
یہ عزم جواں- جرات رندانہ کے پیکر
اس مرحلہ شوق میں حیراں نہیں دیکھے
جل جاتے ہیں اک آنمیں- شعلہ ہے کہ مقتل
ایسے بھی کبھی ہمنے شہیداں نہیں دیکھے

دل میں تو دہکتے ہیں یہ جانسوز شرارے
باہر سے جو دیکھو نہ تپش ہے نہ دھواں ہے
تو بھی کبھی شعلے کو تمنا کی ہوا دے
جو راز حقیقت ہے اس آتش میں نہاں ہے
وہ جیت گئے جانئے میدان طلب میں
شعلے پہ جو پروانہ صفت جان کو ہارے
جن لوگوں نے یہ آتش سوزاں ہی بجھادی
وہ داغ سیاہی کا بجاں لے گئے بارے
اور جن کے دلوں میں ہیں محبت کے الاو
پہنچے ہیں حقیقت کو- وہی پہنچے ہیں پیارے

شیخ ایاز

اللہ بخش عقیلی

سید علی ملتانی
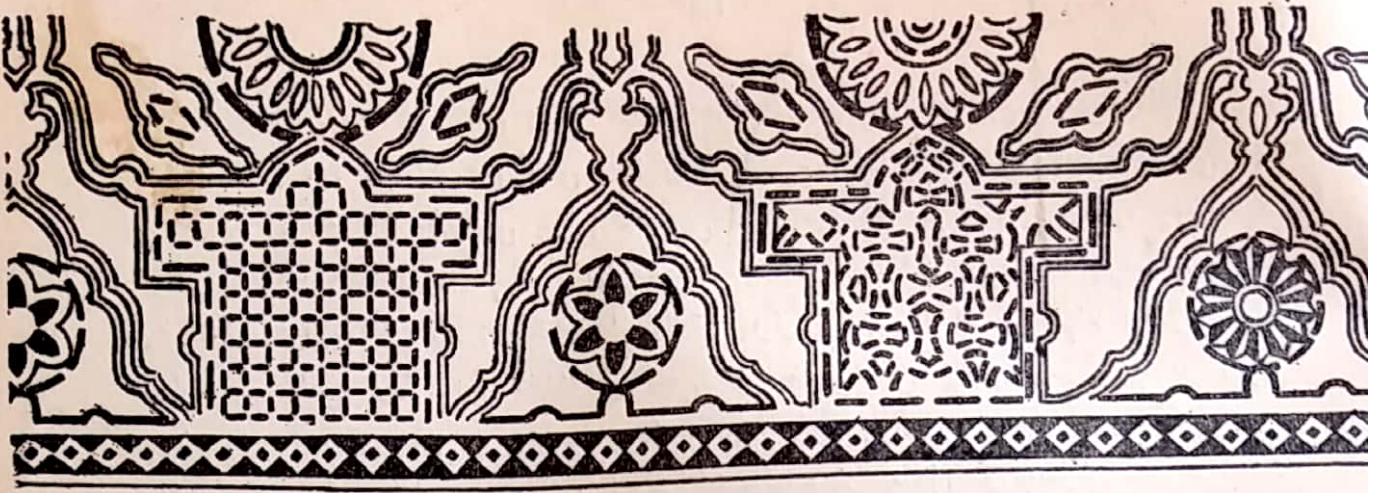
دریا کی شفاف سطح پر شفق کا عکس لرز رہا تھا۔ افسردہ اور اداس شام کے سائے چاروں سمت پھیلتے نظر آ رہے تھے۔ اور فضا پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ یکایک کسی چیز کے دھم سے گرنے کی آواز آئی۔ دریا میں چند لہریں نمودار ہوئیں۔ اور دور دور تک پھیل گئیں۔ کنارے پر ایک خوبصورت عورت اور ایک چوڑے چکلے کاندھوں والا مرد کھڑا تھا۔ عورت کی آنکھوں سے اداسی ٹپکتی تھی۔ اس نے بڑی مغموم نظروں سے صندوق کی طرف دیکھا جو شفاف پانی پر بہا جا رہا تھا۔ مرد کی آنکھوں میں عزم و استقلال کے ساتھ نفرت بھی جھلک رہی تھی۔ اس نے صندوق کی جانب سے منھ پھیر لیا۔ یہ مرد نابینا برہمن تھا اور یہ عورت اس کی بیوی تھی۔

اس واقعہ کو صدیاں گزر گئیں۔ لیکن سندھیوں کے دل میں یہ اس طرح تازہ ہے جیسے ابھی کی بات ہو۔

نابینا کے گھر میں جشن ہورہا تھا۔ صحن میں شہنائیاں بج رہی تھیں۔ کیونکہ شادی کے چار سال بعد اس کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ آنگن میں بیٹھے ہوئے جوتشی عود اور لوبان کی خوشبو سے لپٹی ہوئی فضا میں لڑکی کا جنم پتر بنارہے تھے۔ دفعتاً ایک جوتشی چونک اٹھا۔ اور مہمانوں نے تعجب سے اسے دیکھا۔ کیوں۔ کیا ہوا۔ انھوں نے سوال کیا۔ جوتشی کا منھ اتر گیا تھا۔ ہکلاتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا۔ یہ لڑکی کسی مسلمان سے شادی کریگی اور نابینا نے بچی کو صندوق میں ڈالکر سطح دریا پر رواں کردیا۔ وہ رات گزر گئی اور صبح ہوگئی۔ شبنم آلود ہوا میں خنکی بسی ہوئی تھی۔ دریا پر دھندلکا چھایا ہوا تھا اور لہریں لپک لپک کر ساحل کو چھوتی تھیں۔ گھاٹ پر دھوبی جمع ہوچکے تھے۔ اور کپڑے دھونے کی آواز فضا کی خاموشی کو چیرتی جاتی تھی۔ اچانک ایک دھوبی چلایا "یا اللہ یہ کیا چیز ہے"۔ دوسرے دھوبی بھی اس کے قریب آئے۔ دھوبی نے ایک صندوق کو پکڑ رکھا تھا۔ جس میں کسی نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ سب لوگ حیران تھے۔ تعجب کے ساتھ سب نے ملکر صندوق اٹھایا اور اسے اپنے چودھری محمد دھوبی کے پاس لے گئے۔

محمد دھوبی کے پاس خدا کا دیا ہوا اور تو سب کچھ تھا۔ لیکن اولاد کی نعمت سے وہ بھی محروم تھا۔ اس نے صندوق کا ڈھکنا اٹھایا تو اس میں ہنستی ہوئی ایک بچی نظر آئی۔ ایک چھوٹی سی گڑیا پڑی پڑی ہاتھ پاوں مار رہی تھی۔ اس نے بچی کو اٹھاکر سینے سے لگایا۔ اسکو خدا کا دیا ہوا عطیہ سمجھا اور اسکا نام رکھا سسی یعنی چاند۔

بھنبھور کے شہر میں جہاں محمد دھوبی رہتا تھا۔ ان گنت کارواں گزرتے رہتے تھے۔ ہر سالار کاروان مہمان نواز محمد دھوبی کے یہاں کچھ عرصہ قیام کرتا تھا۔ اور جب یہ کاروان بھنبھور کی سر زمین چھوڑ کر نگر ٹھٹھہ کی طرف گامزن ہوتے تھے تو چاندنی راتوں میں جبکہ صحرائے سندھ سونے کی جلتی ہوئی کان دکھائی دیتا۔ وہ بھنبھور کے چاند کا ذکر ضرور کرتے تھے۔ جس امیر کاروان نے سسی کو دیکھا تھا وہ بڑے لطف سے اس کے متعلق باتیں کرتا تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ سسی اوس کے موتیوں سے لدا ہوا ایک صحرائی پھول ہے۔ کوئی کہتا کہ سسی کی آنکھیں ایسے جھلملاتی ہیں جیسے چاندنی میں ریت اور کوئی صرف سسی کہکر مسکراتا تھا اور خاموش ہوجاتا تھا۔ اس طرح رفتہ رفتہ سسی کے حسن کا چرچا دیس دیس ہونے لگا۔

ایک رات محفل جمی ہوئی تھی۔ ہوا کے جھونکوں سے چراغوں کی جگمگاتی ہوئی لو دھمک اٹھتی تھی۔ کیچ مکران کا شہزادہ پنوں مسند نشین تھا اور ادھر ادھر کی باتیں ہورہی تھیں۔ کہ اتنے میں کسی نے سسی کا ذکر چھیڑا۔ ساری محفل چہک اٹھی۔ حسن و رومان کی باتیں ہونے لگیں۔ سسی کے تصور سے جیسے شہزادہ پنوں کے چہرے کا رنگ نکھر گیا۔ مدت سے اسکے خواب و خیال کی دنیا کسی کی آمد کی منتظر تھی۔ وہ محفل سے اٹھکر ایوان میں ٹہلنے لگا۔ رات کے گہرے سناٹے میں پنوں کا سینہ جذبات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اپنا وطن چھوڑے یا نہ چھوڑے۔ اپنے والدین سے اجازت لے یا ان سے کچھ کہے سنے بغیر چلا جائے۔ آخر اس نے طے کرلیا کہ وہ جسطرح بھی ممکن ہوگا سسی تک پہونچیگا۔

بھنبھور کے گھر گھر میں چرچا ہونے لگا کہ مکران سے ایک مشک و عنبر کا سوداگر جسکا نام پنوں ہے اپنا قافلہ لیکر آیا ہے۔ خوشبو سے سارا شہر مہک اٹھا۔ سسی جو خود بہار آفرین پھول تھی۔ پنوں کی منزل پر مشک خریدنے کے لئے آئی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ مشک و عنبر کی خوشبو میں بسے ہوئے پنوں کا تصور لئے ہوئے وہ گھر واپس ہوئی۔ اور کوشش میں رہی کہ پنوں کی دل آفریں ہستی نے اس پر جو سحر کیا ہے اس سے اثر انداز نہ ہو۔ لیکن آخرکار سسی سے نہ رہا گیا اور اس نے اپنی سکھی کو روداد دل کہہ سنائی۔

سکھی نے محمد دھوبی سے اشاروں میں اس کا ذکر کیا۔ لیکن محمد نے کہا "میں اپنی لڑکی کو اپنی قوم سے باہر نہیں دونگا"۔ سکھی نے جواب دیا "پنوں بھی تو دھوبی ہے" محمد کو یقین نہیں آیا اور اس نے کہا۔ "اگر دھوبی ہے تو ذرا یہ کپڑے دھوکر دکھائے"۔ اور پھر اس نے کچھ موٹے کھردرے کپڑے اٹھاکر سکھی کو دئے۔ جن کو پنوں نے دریا پر لے جاکر دھویا۔ انہیں دھوتے ہوئے اس کے ہاتھ زخمی ہوئے۔ اور کپڑے تار تار ہوگئے۔ پنوں دلگرفتہ ہو کر دریا کے کنارے بیٹھ گیا۔ سسی کی سکھی نے اسے آکر جھنجوڑا اور تسلی دیکر کہا کہ اگر وہ ہر کپڑے میں ایک ایک اشرفی ڈال کر مالکوں کو دے آئے تو وہ شکایت نہ کرینگے۔ پنوں نے ایسا ہی کیا۔ اور کوئی بھی اس نئے اناڑی دھوبی کی طرف سے نالاں نہ ہوا۔ اور محمد کو اطمینان ہوگیا کہ پنوں بھی اس کے کسی ہم پیشہ خاندان سے ہے۔ اس کے بعد اس نے سسی کا نکاح پنوں سے کردیا۔

پنوں کے دن رات سپنے کی طرح گذر رہے تھے۔ لیکن اب اس کے رفیق اور احباب اس نئی جگہ سے تنگ آگئے اور انہیں وطن کی یاد ستانے لگی۔ پنوں گویا خواب میں کھویا ہوا تھا۔ اور کوئی اسے جگانے کی کوشش کرتا تھا تو چونک کر وہ اسے ہٹادیتا تھا۔ اور پھر اس کیف زا نیند کی دل آویزیوں میں کھوجاتا تھا۔

پنوں کے والد نے پیغام بھیجے۔ لیکن پنوں اپنے ارادے پر جما رہا۔ اس نے بھنبھور کو اپنا دیس بنالیا تھا۔ جب قاصد نے واپس جاکر بادشاہ کو ساری داستان سنائی تو وہ بہت مغموم ہوا اور اپنے تین لڑکوں۔ چنڑے۔ ہوتی اور موتی کو حکم دیا کہ جیسے بنے وہ پنوں کو لیکر واپس لوٹیں۔

پنوں کے بھائی بھنبھور پہنچے۔ پنوں نے ان کی آمد کی خوشی میں ایک جشن منعقد کیا۔ محفل رنگ پر آئی اور مغنیہ نے ایک سندہی دوہا گانا شروع کیا۔ "ندی سوکھ جانے کے بعد پنچھی اڑ جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں"۔ اسے سنکر ایک طرح کے کرب کے ساتھ پنوں کے دل میں خیال آیا کہ وہ ایک پنچھی ہے۔ جسے لڑکے تالیاں بجاکر اڑا رہے ہیں۔ اس نے سوچا "ہائے یہ لڑکے کیوں تالیاں بجاتے ہیں اور اس پنچھی کو اڑاتے ہیں"۔

اس نے صراحی سے باقی ماندہ شراب جام میں انڈیل لی۔ اور سارا جام پی گیا۔ جب شراب اس کے خون میں گھل کر رگوں میں دوڑنے لگی تو اسے گہری نیند محسوس ہونے لگی اور کچھ دیر بعد وہ وہیں سوگیا۔ محفل برخاست ہوئی۔ پنوں کے بھائی چندے نے سوتے ہوئے پنوں کو اپنے ساتھ اونٹ پر سوار کیا اور اپنے بھائیوں کے ساتھ تیزی سے مکران کی طرف روانہ ہوگیا۔

صبح کو جب سسی کی آنکھ کھلی تو پنوں کو موجود نہ پاکر وہ بہت پریشان ہوئی۔ اور جب اسے علم ہوا کہ اسکے بھائی اسے مدہوش کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ دیوانی ہوگئی۔ اس نے کہا۔

"میرے سجن۔ مہار تھام لو۔ اونٹ کو روکو۔ اس کنیز کی چوکھٹ کو اپنے پاوں سے نوازو۔ اے میرے دوست میں نے تمھارے بغیر ہر پل میں قیامت کا سماں دیکھا"۔

"اے کاش! اس کے اونٹوں کو دھوپ نہ ستائے۔ اے کاش! اسے راستے میں پیاس نہ لگے"۔

پھر دن ڈھلا اور شام کی تاریکی پھیلی۔ چوری چھپے سسی گھر سے نکلی اور اس نے مکران کا رخ کیا۔ ساری رات وہ ستاروں سے بات کرتی رہی اور پیدل چلتی رہی۔ ہیبتناک صحرا اس کے چاروں سمت دور دور تک پھیلا ہوا تھا اور وہ اس میں سرگرداں تھی۔ رات بیت گئی۔ صبح ہوئی۔ لیکن وہ چلتی رہی۔

اس کے نازک پاوں میں آبلے پڑ گئے۔ درختوں کے کانٹوں سے اس کا جسم زخمی ہوگیا اور کپڑے تار تار ہوگئے۔ وہ گوشت و پوست سے بنی ہوئی سسی نہیں تھی۔ وہ تو محض ایک واہمہ تھی۔ پنوں کا ایک سیال تصور۔ وہ تپش و تشنگی۔ گرد و باد سے بے پرواہ ایک طرف کو بڑھتی چلی جارہی تھی۔ سارا دن وہ چلتی رہی اور جب کہرے نے زمین کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو اس کو ایک جھونپڑا نظر آیا۔ قریب جاکر اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک پنوار باہر نکل آیا۔ سسی کے تھکے ہوئے خاک آلودہ لیکن جگمگاتے ہوئے حسن کو دیکھکر پنوار کی نیت بدل گئی۔

سسی نے اس سے پوچھا کہ "تم نے کہیں میرا پنوں تو نہیں دیکھا"۔ پنوار کہنے لگا "دنیا میں سینکڑوں پنوں ہیں تم ایک پنوں کو کیا پوچھتی ہو"۔ سسی نے جواب دیا۔ "پنوں تو سیکڑوں ہونگے لیکن میرا پنوں وہی ہے جس نے میرے دل پر جادو کردیا"۔

پنوار کے تیوروں سے خوفزدہ ہو کر وہ واپس جانے لگی تو پنوار نے اس کا بازو پکڑلیا۔ سسی چیخی۔ لیکن پھر بھی وہ باز نہ آیا۔ آخر کار سسی نے زمین سے پناہ مانگی کہ "اے دھرتی ماتا مجھے اپنے دامن میں چھپالے"۔ اس کی فریاد سنکر زمین شق ہوگئی اور اسے اپنے دامن میں چھپاکر پھر یکساں ہوگئی۔

پنوں کو جب ہوش آیا تو اسنے دیکھا کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ ہچکولے کھاتا چلا جا رہا ہے۔ پریشان ہوکر اس نے چنڑے سے پوچھا۔ "ہم کہاں جار ہے ہیں" جب چنڑے نے ساری حقیقت سنائی تو وہ دیوانہ سا ہوگیا اور اونٹ سے چھلانگ لگاکر ایک طرف کو دوڑنے لگا۔ اسے یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ راہ کہاں جارہی ہے۔ وہ سسی سسی پکارتا جارہا تھا۔ پتھر۔ پہاڑ۔ درخت۔ جنگل سب ایک ہوکر بازگشت میں جواب دے رہے تھے - - -سسی!

اچانک ایک طوفان اٹھا۔ بادل گرجنے لگے۔ برق و رعد نے سنسان فضا کو لرزادیا۔ پنوں پکارتا جارہا تھا۔ "سسی چاند" لیکن چاند تو اس وقت بادلوں کے بھیانک گھیرے میں چھپ گیا تھا۔ اتنے میں اسے دور سے آگ جلتی ہوئی نظر آئی اور وہ ادھر لپکا۔ جھونپڑے کے دروازے پر پنوار کھڑا ملا۔ پنوں نے اسے جھنجھوڑکر کہا "تم نے میری سسی کو دیکھا ہے"۔ پنوار رو رہا تھا۔ اس نے پنوں کا ہاتھ پکڑا اور اسے وہاں لے آیا جہاں سسی زمین میں سماچکی تھی۔ اچانک برق چمکی اور پنوں کو اس کی روشنی میں سسی کے دوپٹے کا پلو نظر آیا جو زمین کے اوپر رہ گیا تھا۔ اس نے ایسا محسوس کیا گویا کسی نے اسے پہاڑ سے نیچے پھینک دیا ہو اور وہ پتھروں اور چٹانوں سے ٹکراتا نیچے کی طرف لڑھک رہا ہو۔ اس نے پنوار کو پھر زور سے جھنجھوڑا۔ اور اپنا سوال دوہرایا۔ پنوار روتا رہا۔ الفاظ اس کی زبان پر نہیں آتے تھے۔ بالاخر اس نے پنوں کو ساری داستان سنائی۔ پنوں دوپٹے کو چوم کر چلایا۔ "سسی"۔ زمین سے آواز آئی۔ "پنوں"۔ زمین دوبارہ شق ہوگئی اور پنوں ہمیشہ کیلئے سسی سے مل گیا۔ اس دنیا میں جہاں کوئی انہیں جدا نہ کرسکتا تھا۔

مومل رانو

اللہ بخش عقیلی

سندھ کے نوجوان عرب فاتح محمد بن قاسم نے فتوحات سندھ کے دوران میں یہ اصول رکھا تھا کہ جو مقامی ہندو حاکم خود ہی اطاعت کرلیتا۔ اسے اپنے مقبوضہ علاقے پر قائم رہنے دیتا اور اسلامی فوج کی حفاظت کی ذمہ داری کے عوض اس کو صرف جزیہ کی معمولی رقم اپنی ریاست کی غیر مسلم مردم شماری کے مطابق ادا کرنی پڑتی تھی۔ اس قسم کی بہت سی ہندو ریاستیں سندھ کے اطراف میں صدیوں تک قائم رہیں۔ اور مسلمانوں کے اوائل عہد کا پاس رکھتے ہوئے بعد کے مسلمان حکمران خاندانوں نے بھی ان سے کوئی تعرض نہ کیا۔ سندھ کے بعد پہلے تو خلفائے دمشق و بغداد سندھ کے گورنر مقرر کرتے رہے اور بعد میں جب دور دور کی ریاستیں خود مختار ہوگئیں تو سندھ میں بھی عربوں کی ایک خود مختار حکومت قائم ہوگئی۔

چوتھی صدی ہجری کے آخر میں جب اسماعیلی قرامطہ سندھ پر مسلط ہوگئے۔ تو سلطان محمود غزنوی نے فوج کشی کرکے سندھ کو اپنے زیر نگیں کرلیا۔ لیکن جب محمود غزنوی کے جانشین خانہ جنگی میں مبتلا ہوئے تو جنوبی سندھ پر ایک نو مسلم راجپوت قوم نے قبضہ کرلیا۔ جن کو "سومرہ" کہا جاتا ہے۔ اس سومرہ خاندان کے آخری بادشاہ حمیر سومرو کے زمانہ کا ایک واقعہ ہے جو ہم بیان کر رہے ہیں۔ اور جو سندھ کے قدیم رومانی افسانوں میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت زیادہ مقبول ہے۔ اور سندھی زبان کے شعراء نے اس کو نظم کی صورت میں ڈھال کر اور بھی رومانی اور دلکش بنادیا ہے۔ جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اس وقت سندھ کی جنوب مغربی سرحد پر ایک چھوٹی سی ہندو ریاست تھی جسکا صدر مقام "کاک" تھا۔ آج بھی سندھ کی جنوب مغربی سرحد پر جو آخری تحصیل "شاہ بندر" ہے۔ اسکا جنوب مغربی حصہ

کاک مکان کہلاتا ہے۔ جس سے تھوڑے ہی فاصلہ پر سندھ ندی کی آخری شاخ سمندر سے مل جاتی ہے۔ ان ہندو ریاستوں کے حاکم "رانا" کہلاتے تھے۔ کاک ریاست کا راجہ رانا نند نامی گوجر قوم سے تھا۔ اس راجہ کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ صرف دو حسین لڑکیاں تھیں۔ بڑی کا نام مومل اور چھوٹی کا نام سومل تھا۔ یہ خالص سندہی نام ہیں اور حسین اور نازک اندام کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ ابھی دونوں کنواری ہی تھیں کہ راجہ نند کا انتقال ہوگیا۔ اور ریاست کی باگ ڈور بڑی لڑکی "مومل" کو سنبھالنا پڑی مومل حسین اور ذہین بھی تھی۔ اس نے باپ کی ریاست کو سنبھال تو لیا۔ لیکن پھر بھی اس کو ایک ایسے شریک حیات کی ضرورت تھی جو نہ صرف اسکا خاوند بنے بلکہ ریاست کے کاروبار میں بھی اسکا ساتھی بن کر اسکا بوجھ ہلکا کرے۔ اسلئے ضروری تھا کہ وہ شوہر منتخب کرنے سے پہلے یہ دیکھ لے کہ آیا اس کے ساتھ زوجیت کے تعلقات قائم کرنے کی تمنا رکھنے والا صرف اس کے خداداد حسن اور ریاست کی دولت ہی چاہتا ہے۔ یا اس کے علاوہ ہوشیار۔ سلیقہ مند دانا اور دلیر بھی ہے۔

اس انتخاب کو کامیاب بنانے کیلئے مومل نے ایک نہایت انوکھی ترکیب نکالی۔ کاک میں اس نے ایک ایسا محل تیار کرایا۔ جسکا بیرونی حصہ شیشہ کا تھا اور اس کے چاروں طرف کا میدان اتنا صاف و شفاف رکھا کہ شیشے کا عکس پڑنے سے اس پر جو پانی کی تہہ رکھی گئی تھی۔ وہ بہت گہری نظر آتی تھی اور یوں دکھائی دیتا تھا کہ سارا محل پانی کی جھیل کے اوپر کھڑا ہے اور محل تک پہونچنے کیلئے ایک بڑا فاصلہ گہرے پانی سے تیر کر گذرنا پڑیگا۔ محل کے چاروں طرف پانی کی یہ چھوٹی تہہ اس صفت کے ساتھ قائم کی گئی تھی کہ اس میں کسی وقت فرق نہیں آتا تھا اور پانی کا بہاو متواتر محسوس ہوتا تھا۔ اس وقت بھی "کاک مکان" کے مغرب سے ندی کی بڑی شاخ بہتی ہے۔ جسے ٹنی دریا کہتے ہیں۔ اور جنوب سے دوسری چھوٹی شاخ بہتی ہے۔ جسے "ہنرمائی" کہتے ہیں اور سمندر کے نزدیک ہونے کے سبب ان کا پانی چڑھتا اور اترتا رہتا ہے اور سمندر کے قدرتی مد و جزر کا اس جگہ کافی دخل ہے۔ ممکن ہے کہ اس مد و جزر سے فائدہ اٹھاکر پانی کا بہاو ایک خاص انداز پر قائم رکھا گیا ہو۔ بہرحال لوگ اسے جادو کا کرشمہ سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ محل کے چاروں طرف شیروں کے مجسمے اس طریقہ سے نصب کئے گئے تھے کہ دور سے دیکھنے والے کو اصلی شیر دکھائی دیتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی یہ خوبی تھی کہ ایک کونے پر ایک شیر بیٹھا ہوا نظر آتا تھا تو دوسرے کونے پر وہی شیر دوڑتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ جسطرح آجکل فلم میں ایک تصویر کے مختلف عکس ملکر ایک متواتر حرکت بن جاتے ہیں۔ بہرحال محل کے پانی کے اندر گھیرا ہوا دکھانا اور شیروں کا اس کے ارد گرد گھومنا ایک صنعت تھی جو طلسم یا جادو نظر آتا تھا۔ مومل کے محل میں یہ دو جادو تھے۔ اگر کوئی پانی سے گذرکر اور شیروں کے آگے سے بھی نکل کر مومل کے محل میں پہنچ جاتا تو یہاں اس کیلئے ایک تیسری آزمائش تھی۔ وہ یہ کہ محل کے صحن میں سات کھٹولے ڈالے گئے تھے جن

میں چھ کی نواڑ کچے دھاگے کی تھی کہ آدمی کے بیٹھتے ہی ٹوٹ جائے۔ باقی ایک تخت پکی نواڑ کا تھا۔ جس پر آدمی بیٹھ سکے۔ اس اہتمام کے بعد مومل نے اعلان کردیا کہ جو کوئی اس طلسمی قصر میں داخل ہوکر تخت پر جلوس کرنے کی جرات کریگا۔ میں اس سے شادی کرونگی۔ ملکہ کے حسن کا شہرہ سن کر بہت سے امیدواروں نے محل کا قصد کیا۔ مگر کچھ تو پانی سے ڈر کر رہ گئے۔ کچھ شیروں سے گھبراگئے اور کچھ اندر داخل ہونے کے بعد کسی دھوکے والے تخت پر بیٹھنے کے سبب گرگئے اور ناکام رہے۔ سندھ کچھ۔ کاٹھیاواڑ کے بہت امیرزادوں کو اس مصنوعی طلسم نے پریشان اور ناکام کردیا۔ جنوبی سندھ کا حاکم حمیر سومرو ایک دفعہ شکار کھیلنے گیا ہوا تھا۔ اسکا وزیر آعظم رانا میندھرا اور دوسرے وزیر اس کے ساتھ تھے۔ اس راستہ میں انہیں ایک امیرزادہ ملا جو یہاں سے ناکام ہوکر فقیر ہوگیا تھا۔ اس نے انہیں اپنی داستان سنائی تو حمیر سومرو کو بھی اسکا اشتیاق اور خیال پیدا ہوا۔ تینوں وزیر ساتھ لیکر کاک جا نکلا۔ پہلے تو حمیر خود قصر کی طرف گیا۔ مگر پانی سے ہی گھبرا کے لوٹا۔ اس کے بعد دو چھوٹے وزیر ایک ایک کرکے گئے مگر ناکام لوٹے۔ آخر میں رانا میندھرا گیا۔ یہ سومرو حکومت کا وزیر آعظم اور بادشاہ حمیر کا سالہ بھی تھا۔ اس نے نیزہ ساتھ لے لیا تھا۔ پانی میں نیزہ گاڑکر دیکھا تو پانی کم نظر آیا اور یہ اس سے گزر گیا۔ پھر شیروں کو نیزے سے جھنجھوڑا تو مجسمے نظر آئے۔ محل میں جاکر سات پلنگ دیکھے تو یہاں بھی عقل سے کام لیا کہ ان میں ضرور کوئی راز ہے۔ ہر ایک میں نیزہ لگا کر دیکھا جو کچے دھاگے کے تھے۔ ایکدم ٹوٹتے چلے گئے۔ جب پکے تخت کی اچھی طرح تسلی کرلی تو اس پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اسطرح مومل کی شرائط اس نے پوری کردیں اور مومل نے اس سے شادی کرلی۔ لیکن لوٹنے کے بعد اس کے بہنوئی حمیر نے حسد کے سبب اسکو اپنے پایہ تخت میں جاکر قید کردیا۔

اب رانا میندھرا اور مومل کو ایک دوسرے سے عشق ہوگیا تھا۔ حمیر نے رانا کو قید کرکے ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنا چاہا۔ یہاں جذبہ عشق نے رانا میندھرا کی رہبری کی۔ وہ ہر شب اپنے قید خانہ سے بھاگتا اور ایک سانڈنی پر سوار ہوکر مومل کے پاس کاک پہنچ جاتا اور صبح ہونے سے پہلے واپس قید خانہ میں آجاتا۔ تاکہ حمیر کو خبر نہ ہو اور کم از کم یہ پوشیدہ ملاقات کا تعلق ہی مومل کے ساتھ قائم رہے۔ کہتے ہیں دو دل مل جائیں تو زمانہ ان کا دشمن بن جاتا ہے۔ یہاں رانا میندھرا پر حمیر کی پابندیاں تھیں۔ وہاں کاک میں مومل کی بہن سومل کو شرارت سوجھی کہ ایک رات کو مردانہ لباس

پہنکر اپنی بہن مومل کے پاس سوگئی اور جیسے ہی حسب معمول رانا مینڈھرا آیا تو دور سے سمجھا کہ کوئی غیر مرد مومل کے ساتھ سویا ہوا ہے۔ وہیں سے الٹے پاوں واپس لوٹ آیا۔ اور مومل سے ہمیشہ کیلئے بدظن ہوگیا۔ اسطرح جہاں شاہی قید و بند اور زنجیریں بھی اسے اپنے محبوب سے الگ نہ کرسکیں وہاں ایک بدگمانی کام کرگئی۔ اور شکستہ دل مینڈھرا دنیوی کاروبار چھوڑ چھاڑ کر اپنے گاوں "ڈھٹ" میں گوشہ نشین ہوگیا۔ مومل کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو بہت بے چین ہوئی اور پریشان ہوکر سومل سے قطع تعلق کرلیا اور کاک کی حکومت کو بھی خیرباد کہا۔ مینڈھرا کے گاوں "ڈھٹ" میں جاکر مینڈھرا کے محل کے نزدیک ایک گھر بسایا اور اس میں زندگی بسر کرنے لگی۔ کہ کبھی مینڈھرا محل سے باہر آئے تو اسے صحیح واقعات بتاکر اس کی غلط فہمی دور کرنیکا موقع ملے۔ مگر مینڈھرا کا دل کچھ اسطرح ٹوٹا کہ اس نے آنا جانا اور کسی سے ملنا جلنا ترک کردیا۔

مومل نے ہرممکن کوشش کی اور ناکام رہی اور آخر اس دکھ اور مایوسی میں دنیا سے چل بسی۔ رانا مینڈھرا کو جب یہ سب معلوم ہوا تو اسے ہوش آیا۔ لیکن اب اسے کہاں ڈھونڈتا۔ وہ ہمیشہ کیلئے اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ وہ اس کے عشق میں جلکر راکھ ہوگیا تھا اور اس غم میں اس کی حیات کا چراغ بھی گل ہوگیا۔

یہ ہے وہ داستان جسے شاہ عبداللطیف نے عشق حقیقی کا جامہ پہناکر اس طرح نظم کیا ہے کہ سننے والے وجد میں آجاتے ہیں۔

عمر ماروی

سیّد علی ملتانی

قیام پاکستان سے کئی سو برس قبل کا ذکر ہے کہ عمر کوٹ میں شاہ عمر کے نام کا ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ یہ بادشاہ سومرو قوم کا فرد تھا جو قرامطی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اور سندھ بھر کے نہ صرف حاکم بلکہ روحانی پیشوا بھی سمجھے جاتے تھے۔ شاہ عمر میں یہ وہ تمام اوصاف پائے جاتے تھے جو ایک اچھے بادشاہ میں ہونے چاہئیں۔ ہمت و شجاعت تو اس کی سرشت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ فتح و ظفر ہمیشہ اس کی ہم عنان رہتی تھی۔ جہاں جاتا کامیاب و کامران لوٹ کر آتا۔ عدل و انصاف کا یہ حال تھا کہ کوئی بھی فریادی اس کے دربار میں حاضر ہوکر شاکی نہیں جاتا تھا۔

کہا گیا ہے کہ بے عیب صرف خدا کی ذات ہے۔ شاہ عمر میں ہزاروں خوبیاں ہوں مگر ایک واقعہ اس کی سوانح حیات میں بھی ایسا آیا جس کی وجہ سے اس کی زندگی داغدار ہوکر رہ گئی ہے۔ وہ واقعہ اسطرح بیان کیا جاتا ہے۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ شاہ عمر دربار میں بیٹھکر اپنے امیروں۔ وزیروں اور درباریوں کو عدل و انصاف کی نصیحت کر رہا تھا۔ اس کا بیان تھا کہ جسطرح چونے اور گارے کے بغیر کوئی دیوار کھڑی نہیں ہوسکتی۔ اس طرح عدل و انصاف کے بغیر بھی کوئی سلطنت زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتی۔ آخر میں اس نے اپنے تمام امیروں۔ وزیروں اور درباریوں کو پر زور الفاظ میں تلقین کی کہ وہ ظلم و ستم اور جور و جفا سے احتراز کریں جو خدا کی نظر میں سب سے گھناونا فعل ہے۔ اور اس طبقہ کیلئے جو

اولی الامر کہلاتے ہیں- زہر ہلاہل کا کام کرتا ہے- ابھی وہ اس قسم کے مواعظ و نصائح میں مشغول ہی تھا کہ ایک اجنبی نوجوان اس کے قصر سلطنت کے دروازے پر آکر رکا اور بادشاہ سے تنہائی میں ملاقات کرنے کی اجازت چاہی- بادشاہ نے بھی کوئی ستم رسیدہ سمجھکر دربار برخاست کردیا تاکہ اس کی کہانی اطمینان کے ساتھ سن سکے-

جس زمانہ میں عمر بادشاہ عمر کوٹ پر حکومت کرتا تھا اسی زمانہ میں ملیر نام کی ایک بستی میں جو صحرائے تھار میں واقع ہے- پلوی نام کا ایک غریب گڈریا رہتا تھا- خدا نے اسے ماروی نام کی ایک خوبصورت- خوب سیرت دختر عطا کی تھی جو حسن و جمال میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی- ابھی ماروی بہت ہی کم سن تھی کہ پلوی نے ماروی کی منگنی اپنے بھائی کے بڑے بیٹے کھیٹ کے ساتھ کردی جو مردانہ حسن و جمال میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا- ماروی اور کھیٹ بچپن سے ہی ایک دوسرے کے ساتھ محبت کرتے تھے- مگر ان کی یہ محبت ایک شخص کو بالکل نہیں بھاتی تھی- وہ شخص تھا پلوی کا نوکر پھوگ- جو بچپن ہی سے پلوی کے گھر میں رہتا اور اس کی بھیڑ بکریاں چرایا کرتا تھا- دراصل یہ شخص ماروی پر ہزار جان سے شیدا تھا- شروع شروع میں اس کا خیال تھا کہ وہ ماروی کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلیگا- لیکن جب اسے اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی تو وہ حسد کے مارے جل اٹھا اور بدلہ لینے کیلئے عمر کوٹ روانہ ہوگیا- تاکہ ماروی اور کھیٹ کو ہمیشہ کیلئے ایک دوسرے سے جدا کرکے اپنی شکست کا بدلہ لے- چنانچہ وہ شخص جو قصر شاہی کے سامنے عمر بادشاہ سے تنہائی میں ملاقات کرنے کیلئے آیا تھا- ماروی کا ناکام و نامراد عاشق پھوگ ہی تھا-

جب شاہ عمر نے پھوگ کو خلوت میں باریابی بخشی تو پھوگ نے اس کے قدموں پر گر کر کہا- "اے بادشاہ! میں آپ سے کچھ مانگنے یا داد و فریاد کرنے نہیں آیا بلکہ آپ کو ایک خوش خبری سنانے آیا ہوں کہ ملیر نام کی بستی میں جو یہاں سے چند میل کے فاصلہ پر صحرا میں واقع ہے- ماروی نام کی ایک لڑکی رہتی ہے- یہ لڑکی حسن و جمال میں اپنا ثانی نہیں رکھتی- کیا قد و قامت اور کیا خد و خال- سب میں بے عیب ہے- اس کی مخمور سیاہ آنکھیں نرگس کو شرماتی ہیں- چہرہ ایسا خوبصورت ہے کہ چاند بھی اس کے سامنے کچھ وقعت نہیں رکھتا- جب وہ مسکراتی ہے تو موتی بکھرتے ہیں- بات کرتی ہے تو پھول جھڑتے ہیں- اس کی مرمریں باہیں اور گلابی رخسار دیکھکر انسان تو انسان فرشتے بھی عش عش کر اٹھتے ہیں- یہ ناممکن ہے کہ کوئی انسان اسے دیکھے اور پھر کسی دوسری چیز کی یاد میں پڑ جائے- بادشاہ! یہ سب کچھ ہے- مگر وہ ایک گڈرئے کی لڑکی ہے- اگر آپ کی نظر عنایت اس پر نہ ہوئی تو وہ تمام عمر ایک گڈرئے کی لڑکی بنی رہے گی- نہ اس کی رہائش اچھی ہوگی اور نہ خوراک و پوشاک- لیکن اگر وہ آپ کے حرم میں پہنچ جائے تو مجھے یقین ہے کہ یہاں اس کی زندگی بھی سنور جائے گی اور شاہی حرم کی رونق بھی بہت بڑھ جائے گی"-

شاہ عمر جو ایک لحظہ قبل عدل و انصاف کی تلقین کر رہا تھا۔ ماروی کے حسن و جمال کی کہانی سن کر ایسا والہ و شیدا ہوا کہ اسے اپنے قول و قرار بھی یاد نہ رہے۔ اس نے فی‌الفور دو باد رفتار سانڈنیاں تیار کرائیں اور پھوگ کو ساتھ لیکر ملیر کی طرف روانہ ہوگیا۔

جب شاہ عمر ماروی کے گاؤں ملیر کے نزدیک پہنچا تو اتفاق سے ماروی بھی اپنی ایک سہیلی کے ہمراہ کنویں سے پانی بھرنے کو نکل چکی تھی۔ ماروی نے دو اونٹوں کو کنویں کی طرف بڑھتا ہوا دیکھا تو بے حد ڈری اور سہیلی سے لوٹ جانے کیلئے کہا۔ مگر سہیلی نے جو کسی قدر نڈر تھی ہنستے ہوئے کہا۔ "ڈرپوک کہیں کی۔ راہگیر ہوں گے۔ پانی پینا چاہتے ہوں گے۔ بہت کرینگے تو ہم سے پانی مانگیں گے۔ اس میں ڈرنے کی بات ہی کیا ہے"۔ ماروی اپنی سہیلی کے اطمینان دلانے پر آگے بڑھی اور دونوں سہیلیاں پانی بھرنے لگیں۔

سانڈنی سوار جب کنویں کے پاس پہنچے تو پھوگ نے شاہ عمر کو دھیمی آواز میں بتلایا کہ ماروی یہی ہے۔ عمر بادشاہ نے جب ماروی پر نظر ڈالی تو اسے قیاس و گمان سے بھی کہیں زیادہ حسین پایا۔ جھٹ اونٹنی کو بٹھایا اور پانی مانگنے کے بہانے اس کے پاس پہنچ گیا۔ ابھی وہ پانی ہی پلا رہی تھی کہ پھوگ نے اسے اٹھاکر شاہ عمر کی اونٹنی پر بٹھلادیا اور اسے لے کر دونوں کے دونوں عمر کوٹ روانہ ہوگئے۔

ماروی کا روتے روتے برا حال ہوگیا تھا۔ شاہ عمر نے اسے لاکھ سمجھایا بجھایا۔ زر و جواہر کا لالچ دیا۔ مگر ماروی کے آنسو نہ تھمنے تھے نہ تھمے۔ جب اسے اپنے ماں باپ اور پیارے منگیتر کی یاد آتی تھی تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے جھرنے پھوٹ پڑتے تھے۔

بادشاہ نے جب یہ دیکھا کہ نرمی اور محبت سے کچھ کام نہیں چلتا تو اسے دھمکایا "کیا تیرے ماں باپ اور تیرا ہونے والا شوہر غریب گڈریئے نہیں جن کے پاس نہ کھانے کو ہے نہ پہننے کو۔ میں تجھے اپنی ملکہ بنانا چاہتا ہوں۔ تو میری سب سے چہیتی رانی ہوگی۔ بول کیا تجھے یہ پسند نہیں؟"۔

"بالکل نا پسند ہے"۔ ماروی نے جواب دیا۔ "اے شاہ عمر میرے ماں باپ نے میری نسبت ایک شخص سے کردی ہے۔ میں جس کی بننی تھی بن چکی۔ اب ہم لوگوں کو موت ہی ایک دوسرے سے جدا کرسکتی ہے"۔

"اے بادشاہ ! مجھ غریب پر رحم فرما۔ ترس کھا اور مجھے اپنے لوگوں تک واپس پہنچادے۔ میں نے مانا کہ آپ کے ہاں مال و دولت کی فراوانی ہے لیکن ہم دیہات کے لوگوں کی نظر میں مال و دولت کی کوئی وقعت نہیں۔ ہمیں تو سیدھی سادی خوراک۔ پوشاک اور سادہ رہائش پسند ہے۔ آپ کے ان عالی شان محلوں اور مکانوں کی نسبت ہمیں اپنے حقیر جھونپڑے زیادہ عزیز ہیں جن میں قدرت اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے"۔

اس دوران میں ماروی کے ماں باپ کو ماروی کی سہیلی کی زبانی پتہ چل گیا کہ ماروی کو عمر کوٹ کا بادشاہ اٹھا کر لے گیا ہے۔ لہذا انہوں نے ماروی کے اچھے مستقبل کا خیال کرکے اسے چھڑانے کی زیادہ کوشش نہ کی۔ لیکن ماروی کے منگیتر کھیٹ نے ہمت نہ ہاری اور وہ فقیروں کا بھیس بدل کر عمر کوٹ پہنچ گیا۔

ایک روز کھیٹ بھیک مانگتا مانگتا عین اس کے محل کے سامنے پہنچ گیا جس میں ماروی مقیم تھی۔ ماروی کی نظر بالا خانہ سے کھیٹ پر پڑی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور نامہ و پیغام کی تدبیر سوچنے لگے۔

اب کے شاہ عمر ماروی کو دیکھنے آیا تو ماروی نے شاہ سے وعدہ کیا کہ اگر بارہ مہینوں کے اندر اندر ماروی کے ماں باپ اسے چھڑانے نہ آئے تو وہ ہمیشہ کیلئے اس کی ہوجائے گی۔ ماروی کے اس وعدہ سے عمر کا دل باغ باغ ہوگیا اور اس نے بہت سی بندشیں جو ماروی پر عائد کردی گئی تھیں سہل کردیں۔

عمر کوٹ کے نواح میں ایک بزرگ کی خانقاہ واقع تھی۔ کھیٹ نے ماروی کا پتہ لگا لینے کے بعد اپنا ڈیرہ وہیں لگا دیا۔ ماروی نے ایک نوکرانی کو اپنا ہمراز بنالیا جو روزانہ اس خانقاہ پر پہنچتی اور کھیٹ کو ماروی کے تمام منصوبوں سے آگاہ کرتی تھی۔

کھیٹ اور ماروی کو جب ایک دوسرے کے ساتھ اسطرح نامہ و پیام کرتے کرتے ایک عرصہ ہوگیا تو انہوں نے ایک تجویز سوچی۔ فیصلہ ہوا کہ ایک مقررہ دن کو شام کے وقت ماروی زیارت کے قصد سے خانقاہ پر پہنچے۔ وہاں پر کھیٹ ایک تیز رفتار سانڈنی تیار رکھیگا اور اولیں موقع پاتے ہی ماروی کو سوار کرکے لے اڑیگا۔

جب مقررہ تاریخ آ پہنچی تو ماروی بہت سی خادماؤں کے ہمراہ شاہ عمر کی اجازت سے خانقاہ میں پہنچی اور مختلف طرح کے چڑھاوے چڑھانے اور دعائیں مانگنے لگی۔ ادھر کھیٹ بھی تاک میں لگا ہوا تھا۔ اولیں فرصت میں اسے سانڈنی پر چڑھاکر یہ جا وہ جا۔ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ خادمائیں بہت چیخیں اور چلائیں۔ لیکن آس پاس ایسا کوئی آدمی نہیں تھا جو ان کی امداد کو آتا۔ ماروی جیسی آئی ویسی ہی اپنے گھر پہنچ گئی۔ شاہ عمر نے لاکھ کوششیں کیں۔ لیکن وہ اسطرح چھپادی گئی کہ پھر اس کے ہاتھ نہ لگی۔

عمر ماروی کا اصل قصہ تو اس قدر ہے لیکن شاعروں اور قصہ نویسوں نے اس میں بہت سے اضافے کئے ہیں۔

تصحیح

صفحہ	مطبوعہ	تصحیح
۷	سر کے تصور میں	پنوں کے تصور میں
۸	مقبلہ	مقابلہ
۱۴	سرور	سرود
۱۴	دیکھنی	دیکھنے
۱۵	مورمیاں	سورمیاں
۴۶	اقعی	واقعی
۴۷	تے	سے
۴۷	حرکی	حرکتی
۴۸	صوفیہ	صوفیا
۵۲	ظابط	ضابط
۵۲	ظبط	ضبط
۵۴	وضح	وضع
۵۷	گالوں سے	گالوں پر سے
۵۸	محببت	محبت